مردِ ابریشم

بانو قدسیہ

یہ ۳۷ء کا واقعہ ہے۔

ان دنوں دھرمسالہ کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ لیکن اس تھوڑے سے معمورہ کے لئے بجلی، پکی سڑکیں، سول ہسپتال، سینما گھر، لڑکے اور لڑکیوں کے لئے دسویں تک سکول بمع ایک عدد انگریز ہیڈ ماسٹر کے موجود تھا۔ ایک ایسا کلب بھی تھا جس میں فیشن ایبل افسران ٹینس، برج اور بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ کلب مخلوط تھا اور اس میں کچھ آزاد خیال پڑھی لکھی اور امیر خواتین بھی برابر کی ممبر تھیں...... شاید اتنا شائستہ شہر ہونے کی بنیادی وجہ اپر دھرمسالہ کی چھاؤنی تھی جس میں گورکھا اور انگریز فوجوں کا قیام تھا۔

پانچ ہزار کی آبادی کے لئے تہذیبی طور پر تو حکومت نے بہت سی عنایات کر رکھی تھیں لیکن ان پہاڑی علاقوں کی شامیں پھر بھی اداس رہا کرتیں...... پہاڑوں میں عموماً شام پڑتے ہی شہر سنسان ہونے لگتا ہے اور پہاڑی لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے پر پہاڑوں کو اندھیرے میں ڈوبتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

ایسی ہی ایک اداس رات میں گھرتی شام کو میری والدہ، بھائی اور میں گھر لوٹ رہے تھے۔ صاف ستھری سڑک کے کنارے بانس کے جھنڈوں میں جگنو جگمگا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی کے بلب روشن تھے۔ سناٹا تھا۔ ایسی خاموشی جو صرف پہاڑوں پر ممکن ہے۔ چلتے چلتے میری نظر آسمان پر گئی۔ ایک ستارہ جو روشنی میں باقی تمام ستاروں سے سوا تھا مجھے نظر آیا اور پہلی بار مجھے یوں لگا کہ میں جلاوطن ہوں اور مجھے اس ستارے میں لوٹ جانا ہے کیونکہ یہی میرا مسکن اور یہی میری منزل ہے۔ میں نے اپنی پڑھی لکھی ماں سے کہا...... "میں اس چمکتے ستارے سے آئی ہوں اور وہیں میرا گھر ہے......"

میری والدہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک بچہ ہیں اور ساری عمر ایک بچہ ہی رہیں، وہ اتنی بات پر بیمار پڑ سکتی ہیں کہ پہلے اوور میں عمران خان نے تین وکٹیں کیوں نہ لیں اور وہ اس بات پر تندرست بھی ہو سکتیں ہیں کہ عمران نے دل توڑنے میں جو کسر نہ چھوڑی تھی اس کے باوجود پاکستان میچ جیت گیا۔ ان میں منفی کو پس پشت پھینکنے کی بڑی صلاحیت ہے اس لئے ایسے سوال ان کے نزدیک بچے کے بے معنی اصرار سے زیادہ نہ تھے
انہوں نے معصومیت سے کہا

"ہم سب اسی ستارے میں رہتے تھے...... تم میں اور پرویز...... یہاں آنے سے پہلے" انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایک بچے میں جب جلاوطنی کا احساس اچانک جاگتا ہے تو اس کے دل پر کیا بیت جاتی ہے۔ ایک بار اس سے پہلے بھی میں نے ان سے ایک اور مہمل سوال کیا تھا اور سکول سے واپسی پر پوچھا تھا۔ "امی گزر گیا کیا ہوتا ہے؟ میری سہیلیاں کہتی ہیں تمہارا ابا گزر گیا ہے......"

میری امی نے بڑے بھول پن سے کہا...... "گزر گیا...... یعنی چلا گیا...... یہ دیکھو ایسے......" وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اور ان کے نزدیک یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا۔

میری ماں کبھی سوال نہیں بنی ہمیشہ جواب کی صورت میں زندہ رہی ہیں۔ وہ کبھی نہیں پوچھتیں کہ یا الٰہی ستائیس برس کی عمر میں بیوہ ہونے پر اتنی لمبی عمر تک کس کے سہارے زندہ رہا جا سکتا ہے؟ اوکھے لوگوں کے ساتھ اوکھی اوکھی باتوں میں الجھ کر انہیں تشنہ باتوں کے جواب نہیں چاہئیں۔ وہ جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر اپنا دل خود بہلا کر کاٹتی رہی ہیں۔ کبھی انہوں نے اپنی اولاد سے یہ سوال نہیں کیا کہ تم لوگوں کے پاس میرے لئے کیا تھوڑا سا وقت بھی نہیں ہے؟ کیا تم میرے کسی کام، کسی مشغلے، کسی دلچسپی میں کبھی بھی شمولیت نہیں کر سکتے؟ وہ اس عمر میں بھی لطیفوں پر ہنس سکتی ہیں۔ سکریبل کھیل کر، گانے گاتے ہوئے چھوٹے بچوں کو کہانیاں سنا کر ان کے لئے نظمیں لکھ کر مسرور ہو جاتی ہیں۔ ان کی عبادت شکر گزاری، عرض گزارنے اور جھگڑنے کے لئے ضرور ہے لیکن وہ اللہ سے سوال نہیں پوچھتیں اس کا احتساب نہیں کرتیں۔ میری حالت ان سے بہت مختلف ہے میرے اندر سوالوں کی کھیپ بھکڑ اپوہلی بن کر اگتی رہتی ہے کچھ سوال خود بخود جوابات میں ڈھل جاتے ہیں، لیکن جو کہنی ٹیک کر کھڑکی میں بیٹھ رہیں ان کے حل کی بھی ایک صورت کبھی نہ کبھی نکل آتی ہے۔

بچپن سے میں نے ایک عادت بنا لی ہے کہ جب کوئی سوال میری روح کو جھنجھوڑ دیتا ہے تو پھر میں یہ سوال کسی سے نہیں پوچھتی۔ بس اسے اپنے اندر گرداب بنانے کے لئے چھوڑ دیتی ہوں پھر اچانک کہیں سے کسی طرح اس کا جواب مجھے آپ سے آپ مل جاتا ہے۔ سن ۴۷ء میں جو سوال میں نے اپنے آبائی گھر کے متعلق اپنی امی سے پوچھا تھا اس کا جواب مجھے قدرت اللہ شہاب سے ملا...... لیکن وہ بھی اس وقت جب انہیں گزرے تین دن ہو چکے تھے۔

شہاب صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کی مجھ میں جرات باقی نہیں رہی کیونکہ جو لوگ بیج سے پودا، پودے سے جھاڑ، جھاڑ سے درخت اور درخت سے جٹا دھاری چھتناری چھاؤں بن جاتے ہیں۔ ان کے متعلق درستگی، سچائی اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا بڑا ہی مشکل ہے۔ عموماً نارمل انسان کی زندگی مثل گھاس کے کٹتی ہے۔ سبزہ کھلا کبھی خشک رہا، کبھی ہرا...... لیکن شکل بدلتا بدلتا کبھی لار وا اور کبھی تتلی نہ ہوا...... شہاب بھائی جیسے لوگوں کو سمجھنا اس لئے بھی سہل نہیں کہ گروتھ ایک مسلسل پروسس ہے۔ پہلے انسان ایک کام کرتا ہے پھر اسے ترک کرتا ہے پھر دوسرا شروع کرتا ہے اسے بھی ترک کرتا ہے...... بعد ازاں ترک ترک کرتا ہے۔ جو لوگ ایسے شخص کو پہلی سٹیج میں

والدہ بانو قدسیہ

دیکھتے ہیں۔ ان کا تجربہ کچھ اور ہوتا ہے..... جو لوگ اسے دوسرے مرحلے میں دیکھتے ہیں وہ کچھ اور رائے رکھتے ہیں۔ اور جو آخری عہد میں ساتھ ہوتے ہیں ان کا مشاہدہ بالکل کچھ اور ہوتا ہے۔ جو شخص صرف لاروا کی شکل کو جانتا ہے وہ کبھی بھی تتلی کو اسی لاروے کی تبدیل شدہ شکل نہیں سمجھ سکتا۔

ایسے لوگ جو گروتھ کے پابند ہوتے ہیں۔ اور جن کے بیچ میں چھتناری چھاؤں کا جرثومہ موجود ہوتا ہے ایسے لوگوں کے متعلق متضاد آراء قائم ہو جاتی ہیں۔ ان کے نظریات کی چھان پھٹک ہوتی رہتی ہے لیکن یہ فقط صاحب اختیار لوگوں کے اختیار کی باتیں ہیں۔ گھاس اس بات پر قادر نہیں ہوتی کہ وہ درخت بن جائے لیکن درخت اس بات کی گواہی ضرور دے گا کہ کبھی وہ گھاس کی صورت ہی دھرتی سے نمو کے لئے نکلا تھا۔

شہاب صاحب کو سمجھنے میں مجھے پورے تیس سال لگے۔ جو سمجھ مجھے آج آئی ہے اس میں شک' ابہام اور الجھن نہیں ہے پورا وثوق ہے کیونکہ یقین کامل نے میرے لئے زندگی کو بہت آسان بنا دیا ہے' اور میں اسے الفاظ' عمل' نظریات یا علم کے حوالے سے نہیں بلکہ وجدان کی راہ سے سمجھنے لگی ہوں جیسے اندھیرے کمرے میں اچانک سورج کی کرن آ جانے سے نہ صرف نظر آنے لگے بلکہ روح میں امید پیدا ہو جائے خوشی جنم لے اور جلاوطنی کا احساس جاتا رہے۔ ایسے ہی شہاب صاحب میرے لئے روشنی کا سامان بنے۔

شہاب صاحب اور عفت سے میری پہلی ملاقات میری شادی سے پہلے ہوئی تھی' لیکن یہ ملاقات مجھ پر اثر انداز اس لئے نہ ہوئی کہ میرا خیال تھا کہ میرے ہونے والے شوہر اپنی معتبری جتانے کے لئے اس بڑے افسر کو ہتھیا لائے ہیں۔ ہماری شادی کچھ ایسے حالات میں ہوئی کہ میرے شوہر اشفاق احمد گھر بدر کر دیئے گئے اور ہم نے اپنی زندگی چھڑے چھانڈ ننگے بچے آدرشوں سے شروع کی..... ہمارے گھر میں سامان نہ تھا صرف آدرش ہی آدرش تھے۔

اشفاق احمد نے رسالہ داستان گو شروع کر دیا۔ یہ رسالہ خوبصورت تھا۔ پر سرمائے کی کمی کے باعث ڈھب سے نہ نکلتا تھا۔ کبھی مہینے کے شروع میں کبھی وسط میں کبھی دو دو ماہ غائب..... عورت کے لئے آدرشوں کی خاطر جینا اور مرنا مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ بچوں کا دم چھلا ایسا لگا ہے جو اسے ہر وقت دنیاوی ضرورتوں کے ساتھ باندھے رکھتا ہے۔ کبھی دودھ' کبھی بوتل' کبھی ٹوپی' کبھی بوٹ' کبھی بچے کی فیس..... کئی چھوٹے چھوٹے اخراجات ایک ساتھ جمع ہوں تو بچہ پلتا ہے۔ ہزار مرتبہ فقیرنی بن کر عورت ہاتھ پھیلاتی دڑے دڑے سہتی ہے تو ایک بچہ جوان ہوتا ہے۔ ان ہی بچوں کی وجہ سے عورت کمینی' جھگڑالو' میکہ پرست' اور شوہر دشمن بن جاتی ہے.....

میں بھی ایک عورت تھی۔ اس وقت میری گود میں انیق خاں اور انیس خاں تھے..... چونکہ بہت چھوٹے تھے اس لئے آدرشوں کے کمبل میں ان کو سردی لگتی تھی..... سمجھ بوجھ تھی نہیں۔ بغیر آسائش رفاقت کے معنی سمجھ میں نہ آتے تھے اور پھر ہر وقت کام ہی کام تھا رفاقت کہیں تھی بھی نہیں۔ کبھی گھر کا کام کبھی رسالے کا کبھی

بچوں کا' زندگی کافی مشکل ہو گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ چوڑی دار پاجامہ پہن' کانوں میں کان پھول سجا' سلیم شاہی جوتی پہن' جب میں وارد ہوں گی تو اشفاق احمد تالیاں بجانے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن اشفاق احمد ہر انسان کے متعلق ایک خواب اپنے اندر چھپا کر رکھتے ہیں۔ وہ بادشاہ گر ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے کہ جس قدر فینٹہ فطرت نے اندر لپیٹ کر رکھا ہے کم از کم اتنا قد ضرور نکل آئے جب میں اپنے بھانویں امراؤ جان ادا بن کر موڑھے پر بیٹھتی تو اشفاق احمد کا منہ کڑوا ہو جاتا وہ کہتے..... "قدسیہ! یہ عورت والے چونچلے چھوڑ دو..... ؟ میری ساتھی بن جاؤ..... میں گاندھی کا فین نہیں ہوں لیکن اس کی پالیسی پر چل کر تمہیں اپنی ذات کا عرفان ملے گا..... کپڑوں کا سہارا نہ لو..... زیور کی محتاجی نہ کرو..... لکھو..... محنت کرو..... رات دن کام کام..... اور پھر کام..... پھر تمہیں ایسی آزادی ملے گی جس کا کوئی بھی کچھ نہ بگاڑ سکے گا..... "۔

مجھے "کام کام کام" کی رٹ بری لگتی تھی لیکن مجبوری تھی وسائل اتنے کم تھے کہ میں اشفاق احمد کے مقابل "عیش عیش عیش" کا نعرہ نہ لگا سکتی۔ گردن جھکا کر' سلیپر پہن کر رکتی چلتی کام کی پٹڑی پر چڑھ گئی۔

ان دنوں جب ہمارا رسالہ "داستان گو" لنگڑی چال چل رہا تھا اور ادیب حضرات مضمون لکھنے کا وعدہ کر کے پاس دعدہ نہ کرتے تھے' مجھے ضرورت نے ادیب بنا دیا۔ اب جتنے صفحے کم پڑتے' مجھے افسانہ' مضمون' آپ بیتی' ڈائری جانے کیا کچھ لکھنا پڑتا۔ ان ہی دنوں میں نے شکاریات پر "میر شکاری" کے نام سے کئی مضمون اور "موم کی کلیاں" کے عنوان سے ایک ناولٹ لکھا۔ ضرورت ہی کے تحت ایک دن اشفاق احمد نے مجھے کہا "قدسیہ تم شہاب صاحب پر مضمون لکھ دو..... " اس بار شخصیت میں کچھ نہیں پہنچا میں چپ ہو گئی۔

میں شہاب صاحب کو جانتی نہ تھی ان کے متعلق جو کچھ بھی خام مواد میرے پاس تھا وہ فقط شنید تھی۔ لیکن ایک بات نے مجھے خاکہ لکھنے پر اکسایا۔ میں نے تب تک یہ تجربہ حاصل کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی خان صاحب مجھے کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ چاہے کتنا بھی غلط کیوں نہ ہو ہمیشہ میرے فائدے ہی میں ہوتا ہے اس لئے میر شکاری کے مضمون کے ساتھ ساتھ میں نے قدرت اللہ شہاب پر جو کچھ لکھا وہ من و عن بیان کرتی ہوں' کیونکہ اس طرح آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آدمی کس قدر غلط اندازے لگاتا ہے کس قدر بیوقوفی سے سوچتا ہے۔ انسانی ذہن ہمیشہ بطخ کی طرح تیرتا ہے۔ نیچے اتھاہ گہرائیوں میں جو سیپیاں موتی ہوتے ہیں بطخ کو ان کا علم ہی نہیں ہو پاتا۔ تیس سال کی واقفیت کے بعد آج بھی میں اصلی شہاب صاحب کو نہیں جان پائی۔ میں صرف اس روشنی کو جانتی ہوں جو ان کی وجہ سے میری زندگی میں در آئی۔ یہ مضمون قریباً اٹھائیس سال پرانا ہے جسے میں آپ کی نظر سے گزارنا ضروری سمجھتی ہوں......

قدرت اللہ شہاب

ایک محفل میں پچھلے دنوں ایک نہایت طرحدار خاتون سے ملاقات ہوئی۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ حال ہی میں فرانس سے امپورٹ کی گئی ہیں۔ ان کا علم پاکستان کے متعلق ایسا ہی تھا جیسا عموماً سیاحوں کا ہوتا ہے انہوں نے جدید ترین فیشن پر بات کرتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ کس قسم کی تراش کے لباس میں عورت کے جسم کے یہ یہ عیوب چھپ جاتے ہیں اور بل بوٹم پاجامے میں چال کس طرح سحرانگیز ہو جاتی ہے۔ جب فیشن پر سیر حاصل بحث ہو چکی تو آخر میں انہوں نے سوال کیا...... آپ کے ادب میں آج کل کون سا فیشن مقبول عام ہے؟

چونکہ میری معلومات کم تھیں۔ اس کا سوال سن کر میں چکرا گئی اور جواب دیا۔ میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔ وہ کہنے لگیں کچھ دیر ترقی پسند ادب والوں کا بڑا زور شور تھا۔ پھر کچھ دیر یہ غزل بڑی مقبول رہی، تیرا غم ہے در حقیقت مجھے زندگی سے پیارا...... کبھی کبھی لوگ اچانک کسی مصنف کو بہت اہمیت دینے لگتے ہیں اور پھر ایک دن پتہ چلتا ہے کہ وہ تو اب ختم ہو چکے ہیں اور فلمی دنیا سے منسلک ہو جانے کے بعد ان کی بات کرنا گویا ادبی ذوق کے فقدان کی دلیل ہے یہ بتایئے آج کل ایسا جدید ترین وضع کا ادیب کون سا ہے؟ جس کو فیشن کہا جا سکے......

میں نے حسد بھری آہ بھری اور آہستہ سے کہا...... آج کل قدرت اللہ شہاب پر مضمون لکھنے اور لکھوانے کا فیشن ہے۔

فیشن میں ایک عیب بڑا جان لیوا ہے۔ اگر محض تقلیداً فیشن کیا جائے تو بیشتر انسان نکو بن جاتا ہے نہ بڑی بوڑھیاں پسند کرتی ہیں اور نہ وہ مورزادیاں پسند کرتی ہیں جن کے پر چرا کر مور بننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فیشن زدگی کے طور پر مضمون لکھنا تو قبول کر لیا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ میں شہاب کو اس طرح جانتی ہوں کہ جیسے کسی بڑی کوٹھی کے پھاٹک پر روز کسی بڑے آدمی کے نام کی تختی سکول سے آتے جاتے پڑھی ہو...... اس کے بچوں کو آیا کے ساتھ لان میں پلاسٹک کی ٹیوب کے ساتھ ننے کپڑے بھگوتے دیکھا ہو اس کی پورچ میں لمبی لمبی کاریں رکتی اور کھڑی ہوتی نظر سے گزری ہوں۔ اس گھر سے نکلنے والے وردی پوش بیرے، خانسامے سائیکلوں پر سے گزرتے دکھائی دیئے ہوں، پورچ سے ملحق برآمدے میں کبھی کبھی خوبصورت کین کی کرسیوں پر ان دوست احباب کو بھی دیکھا ہو جو اس گھر میں آتے رہتے ہوں لیکن جس نام کی تختی باہر آویزاں ہے اس کے مسمّیٰ سے مکمل ناواقفیت ہو......

جس انسان کے پاس ناواقفیت کی انڈکس موجود ہو، اس سے آپ یہ توقع نہ رکھئے کہ وہ آپ کو سیر حاصل قسم کا مضمون دے سکتا ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح عجائب گھروں میں گائیڈ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور کہتا جاتا ہے یہ کانگڑہ سکول کی تصویر ہے اس میں سنبل زادی پنکھا جھل رہی ہے۔ شیر کا شکار کھیلنے والا راجپوت ہے اور مرمر کے تخت پر براجمان سلیم چشتی رحمتہ اللہ ہیں۔ اور ان کے قدموں میں مور پنکھوں کا بادکش ہاتھ میں لئے شیخو بابا بیٹھا ہے۔ یہ گندھارا اسکول آف آرٹ ہے اور یہ بت بدھ کا ہے جب وہ کپل وستو سے لشیودھرا کو سوئی ہوئی چھوڑ کر جا رہا تھا...... یہ موہنجوداڑو کے برتن ہیں۔ ان میں وہ لوگ گندم اور جو رکھتے تھے اور ان برتنوں میں عورتیں اپنا زیور محفوظ کر کے رکھا کرتی تھیں۔ اب گائیڈ آگے آگے چلتا ہے...... ایک عنوان کو سورنگ سے باندھتا ہے اور آپ کی متحیر آنکھوں سے متوقع رہتا ہے کہ اس کی ہر بات کو مکمل ریسرچ اور شدہ علم پر محمول کریں۔ میرا علم بھی گائیڈ کی طرح سنی سنائی پر زیادہ اور تحقیق پر کم مبنی ہے......

میں آپ کے حسن ظن سے امید باندھ کر چلی ہوں کہ جو کچھ بھی شہاب صاحب پر لکھنے والی ہوں اسے کم از کم اسی دلچسپی سے سنیں جس دلچسپی سے آپ گائیڈ کی باتیں سنا کرتے ہیں۔ کیونکہ شہاب صاحب بھی عجائب گھر میں رکھے ہوئے کسی ایسے مجسّمے کی طرح ہیں جو آپ تو کم بولتے ہیں لیکن ان کے متعلق مختلف قسم کی باتیں زیادہ مشہور ہو جاتی ہیں۔

شہاب صاحب سے میرا تعارف ہمیشہ دوسروں کی وساطت سے ہوا۔ یوں سمجھئے جیسے علاؤالدین کا تعارف پدمنی سے آئینے کی سطح نے کروایا اسی طرح میرے اور شہاب صاحب کے درمیان کئی شفاف، کئی کھردرے، کئی اندھے، کئی دودھیا، کئی ٹوٹے ہوئے، کئی نیم اجلے نیم میلے، کئی تکون چوکور مدور، اور کئی محدّب شیشے حائل ہیں۔

سب سے پہلے میں نے انہیں ایسی تین بہنوں کی آنکھوں سے دیکھا جو اپنی اپنی جگہ شہاب کو اپنا بر تصور کرتی تھیں۔ بڑی نے جو ناک میں بولتی تھی مجھے کہا...... "شہاب دراصل مجھ میں انٹرسٹیڈ ہیں۔ وہ جب بھی بات کرتے ہیں۔ میری طرف ضرور دیکھتے ہیں۔ ڈیڈی سے باتیں کرتے کرتے وہ ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ ان کی نظریں کس کو تلاش کرتی ہیں......"۔

دوسری جو فسانہ آزاد کی سپہر آرا کی طرح بڑی عاشق طبع تھی اس نے مجھے بتایا...... "شہاب جانتے ہیں کہ مجھے اندھیرے کمروں سے بڑا ڈر آتا ہے انہیں مجھے ڈرا کر بہت مزا آتا ہے وہ جب بھی آتے ہیں رات گئے تک بیٹھے آسیب زدہ مکانوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ایسی باتیں محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ نہیں جانتے ہیں کہ ان کے منہ سے یہ باتیں سن

کر مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔

چھوٹی از رُدئے انصاف تینوں میں سے بھلی اور بھگت قسم کی لڑکی تھی۔ چوکور ماتھے پر سیدھی مانگ اور سیدھی مانگ کے پیچھے کھجوری چوٹی کرنے والی نے ایک روز مجھے بتایا تھا...... "آپا اور باجی تو نہایت خود پسند واقع ہوئی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ایک ادیب کیسا ہوتا ہے؟ شہاب جب بھی آتے ہیں وہ دونوں آلتی پالتی مار کر ان کے گرد بیٹھ جاتی ہیں۔ کسی کو پروا نہیں ہوتی کافی کب آئے گی...... سکوائش کون بنائے گا۔ کھانے کی میز پر پھول کون سجائے گا؟...... شہاب منہ سے چاہے کچھ کہیں نہ کہیں وہ ساری باتوں کا نوٹس لیتے ہیں۔ ادیب جو ہوئے......"۔

غالباً شہاب صاحب مجموعی طور پر تینوں کا نوٹس لیتے تھے۔ اور علیحدہ علیحدہ انہیں کسی میں بھی دلچسپی نہیں تھی جس طرح دھنک کا کوئی خاص رنگ کسی کے لئے جاذب نہیں ہوتا اسی طرح اس سہ رنگی قوس قزح کی ایک ملی جلی دلکشی تو تھی لیکن پیلے نیلے اور لال میں تفریق مشکل تھی اسی لئے شہاب صاحب ان لڑکیوں کے بارے میں کسی مثبت نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

ویسے مثبت نتائج پر پہنچنے والوں میں سے شہاب صاحب نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں پر ایک جانب محدب اور دوسری جانب معجوف شیشہ چڑھا ہے۔ اسی لئے اس دورخ شیشے نے ان کی آنکھ میں ٹیلی سکوپ کی سی خاصیت پیدا کر دی ہے اور وہ گالیلو گالیلیؒ کی طرح ستاروں پر ایمان لے آئے ہیں۔ نتائج اخذ کرنے سے پہلے چند ثانئے فضا میں تکتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔ "دیکھئے...... کیا ہو...... ہو سکتا ہے کہ شاید حالات یہ نہ رہیں۔ بہت ممکن ہے کہ...... میں نے ابھی کچھ اس بارے میں سوچا نہیں...... فی الحال کچھ سوچنا ایسا ضروری بھی نہیں"۔

شہاب کے متعلق ان کے دوست 'ان کی بیوی 'ان کا بچہ 'ان کے ملازم 'ان کے ماتحت 'ان کے رشتہ دار سبھی کوئی حتمی رائے اس لئے نہیں رکھتے کیونکہ شہاب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کبھی نہیں کرتے۔ ان دونوں کو کہیں لسی اور دہی کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق اتنی کہانیاں 'اتنے نظریئے اور ایسی ایسی قیاس آرائیوں کا دفتر کھلا رہتا ہے۔

ان کے متعلق کچھ ایسی باتیں مشہور ہیں جو نہ تو مکمل طور پر سچ ہیں اور نہ ہی جن کے بطلان کے لئے کوئی سکہ بند ثبوت ہی ملتا ہے۔ ان افواہوں میں سے کچھ ایسی ہیں جنہوں نے شہاب کو ولن میبنز ' فرینک جیرس 'اور رچرڈ برٹن کا ایک ملا جلا ہیولا بنا رکھا ہے۔ ایک افواہ ایسی سرگرم ہے جس کی رو سے شہاب شائی لاک ہیں ان کا ناطہ رہزن انگریا سے ملتا ہے جس کے دبدبے سے پرتگالی ولندیزی اور انگریز قزاق بھی پناہ مانگتے تھے اس اعتبار سے وہ اصل مکرانی ہیں اور بجرے ڈونگے اور موٹر بوٹ سے ان کو ازلی مناسبت ہے۔ کچھ لوگوں کی زبانی یہ بھی سنا کہ شہاب دراصل شہاب نہیں ہیں۔ یہ تو سبزپوش سفید ریش

والے ایک ایسے بزرگ ہیں 'جو ہارون الرشید کی طرح بھیس بدل کر ایک ایسی ولایت کا کام چلا رہے ہیں جس کا اس دنیا کے منصوبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ لوگوں نے انہیں ڈی ٹیکٹیو کا روپ دے رکھا ہے جو انقرہ سے ہانگ کانگ 'ہانگ کانگ سے سنگاپور وہاں سے لاؤس اور لاؤس سے بداپسٹ تک ایک ایسے خفیہ مشن پر رہتا ہے جس کا علم کسی کو نہیں...... چند سیانے لوگوں نے یہ بھی افواہ چلائی ہے کہ شہاب دراصل مٹی کا مادھو ہے وہ اتنا ذہین 'اتنا جاذب 'اتنا پھرتیلا 'اتنا کچھ بھی نہیں صرف اسے افواہوں کا شوق ہے اور ہر افواہ دراصل اس کی خود ساختہ ہوتی ہے...... کسی سیانی ایکٹرس کی طرح۔ کون سی افواہ سچ ہے اور کس حد تک سچ ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اس بات کا احساس ضرور ہے کسی افواہ کی نفی کرتے ہوئے میں نے شہاب صاحب کو کبھی نہیں دیکھا۔ اور اس کی وجہ غالباً وہ نہیں جو آپ سمجھے ہیں وجہ صرف اتنی ہے کہ ان کے نزدیک تردید کرنا غالباً ایک مثبت نتیجے پر پہنچنے کے مترادف ہے اور نتائج اخذ کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں......

باضابطہ طور پر پہلی بار شہاب سے میری ملاقات اشفاق نے کروائی۔ اشفاق کے یہ پہلے دوست تھے جنہوں نے مجھ پر ایک بے دھیانی نظر بھی نہیں ڈالی۔ انہیں نہ میرے نفسیاتی تجزیوں کی ضرورت تھی 'نہ میری دل جوئی کی 'نہ ہی میری مالی مدد کی...... یوں جب پہلی بار میری شخصیت کی نفی ہوئی اور میری خدمات کو فروعی سمجھا گیا تو میری بہت شیم شیم ہوئی اور میری انا نے یہ بدلہ لیا کہ چوری چوری شہاب کے خلاف دل میں دیوار چین تعمیر کروا دی اور جگہ بہ جگہ ایسے کمیونوں کا پہرہ بٹھا دیا جن کے ذمہ صرف ایک ہی کام تھا کہ شہاب کے متعلق دیوار چین میں کہیں شگاف نہ آنے پائے۔ بھلا ہو اس سسٹم کا کہ تا حال دیوار چین قائم ہے۔

اشفاق اور شہاب کی دوستی افریقہ کا وہ پھول ہے جو کلے من جارو کے پہاڑ پر اگتا ہے اور جونہی کوئی ذی روح پاس آ جائے معمولی پتے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شہاب اور اشفاق لوگوں کے سامنے اجنبی ہیں۔ شاید تخلیے میں بھی اجنبی ہوں لیکن لگتا ہے کہ احباب کا پتہ کاٹ کر جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو وہ اپنے اپنے سیف کی چابیاں لگا کر وہ مال متاع ضرور ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں جنہیں انہوں نے عام نظروں سے بچا رکھا ہے۔

پتہ کاٹنے سے مجھے یاد آیا کہ شروع شادی کے دن تھے جب پہلی بار شہاب صاحب ایک شام سمن آباد میں ہمارے ہاں آئے۔ ان دنوں ہم ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس کا باہر والا نلکا سارا دن کھلا رہتا تھا۔ اور اندر کے نلکوں سے مستقل سوں سوں کی آواز آتی تھی۔ نلکے کی وجہ سے باہر کے دس فٹئے باغ میں کیچڑ تھا۔ شہاب جب برآمدے تک پہنچے تو ان کے بوٹ لتھڑے ہوئے تھے۔ کمزور بجلی کی روشنی میں بوٹوں پر سے گارا جھاڑتے ہوئے انہوں نے اشفاق سے کہا...... "میرے ساتھ چلو

تھوڑی دیر حبیب کے پاس بیٹھتے ہیں اور پھر...... میں اسے ساتھ لے جاؤں جی......؟" میں نے گھبرا کر ہاں کہہ دی۔

ان دنوں میرا سکہ وزنی تھا۔ اور ابھی محکمہ ازدواج میں اس کی ڈی ویلیوایشن نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتی تو شہاب کے ساتھ اشفاق کو نہ جانے دیتی لیکن جب کرنسی طاقتور ہو تب کسی حکومت کو فکر نہیں ہوتا۔ سارے فکر تو اس وقت پڑتے ہیں جب اپنے روپے کی قیمت بیرون مارکیٹ میں چار آنے رہ جاتی ہے۔

اس دن کے بعد شہاب جب بھی آتے اشفاق کو اغوا کر کے لے جاتے بالفاظ دیگر میرا پتہ کاٹ دیا جاتا۔ میں زخم خوردہ دل میں سوچتی رہتی کہ وہ دن کب آئے گا جب شہاب مجھ سے کہیں گے "اشفاق کے لئے تو ہم مر گئے کبھی ملتا ہی نہیں۔ وہ بھی کیا دن تھے جب سارا سارا دن لارنس میں بیٹھے مالٹے کھایا کرتے تھے اسے تو اب ہمارے لئے وقت ہی نہیں ملتا"۔

یہ لمحہ گویا میرے لئے فتح مبین کا لمحہ ہوتا۔ میں ان کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کہتی...... "شہاب بھائی آپ اشفاق کی محفلوں کو ترس نہیں رہے ہیں۔ آپ دراصل ایک خاص قسم کے کمپلکس میں مبتلا ہیں۔ آپ اونچی عمارتوں سے خوفزدہ ہیں...... آپ عید کے لئے عید کارڈ خریدنے سے گھبراتے ہیں۔ فلم کا پہلا شو اور سنیچر کا آخری دن آپ کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے...... آپ ذہنی طور پر ورٹیگو کے مریض ہیں"۔

لیکن اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ لمحہ نہیں آیا۔ میں اپنی جگہ فکر مند ہوں کہ کہیں میری یہ تمنا ناکردہ حسرتوں کی فہرست میں ہی شامل نہ ہو جائے اور مجھے ان کا نفسیاتی تجزیئے کرنے کا موقع نہ ملے۔ دراصل شہاب گل دوپہریا کا پھول ہیں اور میں سہ پہر کی وہ گھڑی ہوں جب کوئی دوپہریا کا پھول کھلا نہیں رہ سکتا۔ شہاب وہ بچہ ہیں جس نے استانی کے چاک چرا کر بستے میں رکھے ہیں اور میں وہ مانیٹر ہوں جو استانی سے بھی زیادہ سنگ دل ہے۔ میری اور ان کی شخصیت کی رقمیں اس طرح نہیں لکھی جاسکتیں کہ ان کے درمیان الجبرے کے برابر کی علامت آسکے۔ ہم جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں جیمز بونڈ سیریز کے ایجنٹوں کی طرح ان کا چہرہ واٹر پروف رہتا ہے وہ تبت کے لاماؤں کی طرح علیحدگی اختیار کئے رہتے ہیں اور ان سے ایسی برفیلی ہوائیں آتی رہتی ہیں جیسے پانچ ٹن کے ایئر کنڈیشنر سے یخ بستہ ہواؤں کا نزول ہو رہا ہو۔

اشفاق کی وساطت سے جس شہاب سے ملاقاتیں ہوئیں، ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی وہ شہاب گویا کسی اجنبی آدمی کا وہ کارڈ ہے جو وہ آپ کو یورپ کے سفر کے دوران دیتا ہے اس سے آپ کو شہر کی کسی خوبصورت بلڈنگ یا منظر کا تو پتہ چل جاتا ہے لیکن دیس والوں کی خبر نہیں ملتی......

میرا خیال تھا کہ عفت کچھ دیس والوں کی خبر رکھتی ہوگی اِس لئے جب میں پہلی مرتبہ اپنے بچوں

کے ساتھ شہاب کے گھر پہنچی تو بڑی پر امید تھی۔ میرا خیال تھا کھانے کی میز پر انسان کی شخصیت کی تہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ جو پرت شہاب پر ہیں، وہ دروپدی کی ساڑھی کی طرح لامتناہی ہیں۔

تب شہاب اور عفت کراچی میں رہتے تھے اور ان کی دو منزلہ کوٹھی باتھ آئی لینڈ میں سمندر کی دلدل کے رخ پر تھی۔ پچھواڑے کہیں ریل کی پٹڑی بھی تھی۔ جو غالباً پچھواڑے نہیں بلکہ میرے ذہن میں کہیں بچھی تھی اور رات گئے اس پٹڑی پر ریل گاڑی چھکا چھک آیا کرتی تھی۔ باتھ آئی لینڈ کے سارے قیام کے دوران مجھے صرف یہ علم ہو سکا کہ شہاب کو کھچڑی پسند ہے اور وہ ریڈیو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ معلوم ہو سکا تو وہ صرف اس قدر تھا کہ شہاب کہیں جا رہے ہیں اور ان کا سامان پیک کرانے کے لئے کچھ پیکروں سے بات چیت ہو رہی ہے یہ پیکر کبھی کھوکھوں کی فرمائش کرتے تھے، کبھی ٹاٹ اور پھونس کی پر یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کیا کچھ پیک ہو چکا ہے اور کیا کچھ پیک ہو گا؟

اتنی بات طے ہے کہ ہماری آمد پر شہاب صاحب نے نہایت احتیاط سے اندر والے خانوں میں اصلی شہاب کو روئی کا گھونسلا بنا کر پیک کر دیا تھا۔ اسے اگر چوگا کھلایا جاتا تو ہماری غیر موجودگی میں، ہمارے سامنے تو ایک تھرموس نما شہاب کھانے کی میز پر موجود ہوتے جن کے متعلق یہ فیصلہ نہ ہو سکتا کہ ان کے اندر برف کوٹ کر رکھی گئی ہے کہ ابلتی کافی...... کافی کا ذکر کرو تو مفتی جی کا نام لئے بغیر بن نہیں آتی......

اس کافی کے رسیا جگت گورو نے ہماری زندگی کافی زچ کر رکھی ہے۔ جن دنوں ہم باتھ آئی لینڈ میں اپنے دونوں بچوں سمیت اپنا پہلا ہنی مون منانے گئے تھے۔ ان دنوں شومئی قسمت سے ممتاز مفتی بندر روڈ پر ایک ایسے چوبارے پر مقیم تھے جس کے سامنے رات کے وقت کسی فلم کا اشتہار نیون بتیوں میں جگمگایا کرتا تھا۔ شہ نشینوں پر سے ٹریم چھوٹی سی بس نظر آتی تھی اور ہمسائے میں ایک ایسا سینما گھر تھا جس کے ریکارڈ اور پورے ڈائیلاگ گھر بیٹھے سنائی دیتے تھے۔

باتھ آئی لینڈ میں اترے چوتھی شام تھی کہ اشفاق نے مجھے حکم دیا کہ مفتی صاحب کے گھر چلنا ہے کیونکہ وہ باہر سے بالکل ماڈرن اور اندر سے نہایت دقیانوس قسم کے کنفیوسٹ آدمی ہیں۔ یہ مفتی صاحب کے گھر میں شادی کے بعد میری پہلی رونمائی تھی۔ میں اور اشفاق جب کئی قسم کے پھاٹک، دروازے، زینے اور تختے گزر کر مفتی صاحب کے چوبارے پر پہنچے تو مفتی صاحب ایک لدے پھندے کمرے میں تخت پوش پر ایجنٹا کی غاروں میں پھنسی ہوئی اپسراؤں کی طرح بیٹھے تھے۔ منہ میں حقے کی نے تھی ہاتھ میں شطرنج کا مہرہ تھا شہ نشین میں بھابی اقبال کھڑی بسکٹ کھا رہی تھیں اور تیل کے سٹوو پر کراچی جیسی جگہ میں تھاپیاں سلگ رہی تھیں۔

"کون ہے؟......" مفتی صاحب نے اپنے بھانجے قیصر سے سوال کیا۔ جو بھانجا بھتیجا کم اور تھانے دار زیادہ تھا۔

"ہم ہیں" اشفاق نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"ہم کون......"

"اشفاق......قدسیہ......"

اب مفتی صاحب کا رنگ آوے میں سے نکلی ہوئی سرخ اینٹ جیسا ہو گیا۔

"میں نے سنا ہے تجھے کراچی آئے چار دن ہو گئے ہیں......"

"یہ قدسیہ بھی ساتھ ہے......" مجھے ڈھال کی طرح آگے بڑھاتے ہوئے اشفاق بولے۔

"کہاں ٹھہرا ہے تو......؟......"

"باتھ آئی لینڈ میں......"

"باتھ آئی لینڈ میں......پر کہاں؟......"

اب اشفاق کبھی ایک پاؤں پر بوجھ تولتے کبھی دوسرے پر۔ ان کی آواز میں بھی ایک خاصیت نہ رہی تھی جس کی وجہ سے میں انہیں خان صاحب بلانے لگی تھی۔

"وہ جی باتھ آئی لینڈ میں......قدسیہ اور بچے بھی ساتھ ہیں۔ انہوں نے مدعو کیا تھا مفتی صاحب"۔

"کس نے مدعو کیا تھا تجھے؟۔ میرے سوائے؟......ایسا اور کون ہے سارے کراچی میں؟......" مفتی جی نے اپنی تیکھی ناک کی سیدھ پوچھا۔

"وہ اپنے شہاب صاحب ہیں ناں......؟تو نہیں جانتا شہاب کو......شہاب رائٹر"۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے انیسوں کو جاننے کی......"

قریب والے سینما گھر سے ملکہ پکھراج نے بڑی تنبیہہ بھری آواز میں گایا......

"رب خیر کرے......کیوں دل دھڑکے"۔ اس کے بعد بڑی مغلظ گفتگو ہوئی۔ ایک ایسے مفتی جی میں جو افسروں کے خلاف تھا، ان کے چمچوں کے خلاف تھا اور ایک ایسے شوہر میں جو اپنی بیگم کو پہلی بار من چاہے دوست کے گھر لایا تھا۔ زیادہ گفتگو مفتی جی نے کی اشفاق نے کئی بار فل سٹاپ کے طور پر کہا......"شہاب وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں آپ اسے مل کر تو دیکھئے......"۔

"میں افسروں سے کبھی نہیں ملتا......ان کی ملاقاتیں تمہیں ہی مبارک ہوں......"

"تو جب آپ اس سے ملے نہیں تو پھر رائے کیوں دے رہے ہیں......"

"اس لئے کہ ایسے بہت سے افسروں کو میں جانتا ہوں۔ مگرمچھ کی جلد، ہاتھی کا دماغ اور گیدڑ کا ضمیر......"۔

اس رائے کے بعد میں نے کبھی ممتاز مفتی کے سامنے قدرت اللہ شہاب کا ذکر نہ کیا کیونکہ میں صلح کل قسم کی عورت ہوں اور مجھے سرنگ بچھانے کا کچھ ایسا شوق نہیں ہے۔ ممتاز مفتی بڑے خوبصورت خط لکھتے ہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ خطوں میں بہت خوبصورت تار بھیجتے ہیں۔ باتھ آئی لینڈ کے واقع سے چند سال بعد اتفاقاً مفتی جی کا ایک طویل خط پنڈی سے ملا۔ بڑی خوبصورت انگریزی میں لکھا تھا...... میں اس کا ترجمہ پیش کرتی ہوں۔

صرف شفقو ہا اور قدسیہ جات کے لئے

لگتا ہے کہ وقت آ گیا ہے۔ میں ایک اندھا آدمی ہوں۔ میں دیکھ نہیں سکتا، سمجھ نہیں پاتا لیکن اندھے میں عموماً جذبات کی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ فضا میں کچھ ہے میرے ارد گرد فضا میں مقناطیسی کشش ہے۔ یہ مقناطیسی دائرہ تمہارے دوست ستارہ کی وجہ سے ہے۔ یہ نام اسے ان لوگوں نے دیا ہے جو وثوق سے جانتے ہیں۔ یہ نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

(۱) ...... چاند بڑھتا گھٹتا ہے لیکن ستارہ ہمیشہ جامد رہتا ہے۔

(۲) ...... ستارہ ہمیشہ چاند کے ہمراہ رہ کر اسے راہ سجھاتا ہے۔ ظاہر ہے جونہی ہلال ذرا بھی بے راہ ہو ستارہ اس سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

لگتا ہے کہ ستارہ کے لئے بالآخر یہی منزل ہے کہ وہ ہلال کو مشورہ دینے کے بجائے خود فعال ہو جائے۔ یہ آخری مقام کچھ فخر مندی کا نہیں بلکہ ذمہ داری اور خدمت کا ہے آخری مقام پر پہنچنے کے لئے "س" کو اپنا حالیہ عہدہ چھوڑنا پڑے گا۔ پھر وہ آخری مقام پر آ سکے گا۔ اس وقت اس کے ارد گرد شفقوہا، قدسیہ جات، علی خاں مفتی ہا ہوں گے...... وہ اپنی ساری خوشیاں بانٹتا ہے لیکن اپنے غم سب سے پوشیدہ رکھتا...... وقت کم ہے......

اس خط کے چند دن بعد پھر مفتی جی کا خط ملا۔

شفقو

ستارہ ۹ کو یہاں سے کراچی گیا۔ ۳ دن کراچی۔ ۴ دن ڈھاکہ، ایک دن لاہور، اٹھارہ کو واپسی۔ ستارہ سے تمہارا ملنا ضروری ہے خصوصی بات ہے سستی نہ کرنا......

ممتاز

چونکہ اس تار نما خط میں یہ وضاحت نہ کی گئی تھی کہ ستارہ کس ذات گرامی کا نام ہے اس لئے ساری رات یہ تصفیہ کرتے گزری کہ اس نام کا اطلاق کس ذات شریف پر کریں۔ سلہٹ کی بکری نما مرزا سے لے کر موتی بازار کے راجا صاحب تک سب کے نام کے ساتھ یہ لقب لگا کر دیکھا لیکن یہ دمدار ستارہ کسی کی شخصیت کے ساتھ فٹ نہ بیٹھا تو ہم مارے تجسس کے بھاگم بھاگ ایئرپورٹ پر پہنچے۔

طیارہ پون گھنٹہ لیٹ تھا۔ لیکن ہم ستارہ کو دیکھنے کے اس قدر متمنی تھے کہ وہیں جمے رہے۔

جہاز سے جب سیڑھیاں لگیں اور بیضوی پھاٹک کھلا ایئرہوسٹس کی صورت نظر آنے لگی تو ہم بچوں کی طرح جنگلے پر چڑھ گئے اور ہر آنے والے کو بنظر غائر دیکھنے لگے۔ سب سواریاں ایئرہوسٹس کو سلام کرتی اتر آئیں لیکن ستارہ طلوع نہ ہوا۔

حسنِ اتفاق سے ان ہی سواریوں میں ایک شہاب بھی تھے جو نہایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں بریف کیس جھلاتے باقی سواریوں سے نظریں بچاتے چلے آ رہے تھے۔

ابھی وہ اپنے سامان کی پرچیاں سی ٹٹول رہے تھے کہ ہم باہر نکلنے والے گیٹ پر جا پہنچے۔

"یار تیرے ساتھ کوئی ستارہ نامی آدمی تو نہیں آیا پنڈی سے......"

"ستارہ امتیاز کہ ستارہ قائد اعظم......؟" شہاب بھائی نے سوال کیا۔

اشفاق نے میری طرف دیکھا۔ مفتی صاحب یہ وضاحت کرنا بھول گئے تھے۔

"غالباً ایسی تو کوئی بات نہیں لکھی مفتی نے۔ مفتی کا کوئی دوست تھا جہاز پر؟......

اشفاق نے پھر پوچھا "میں مفتی کو ہی بہت کم جانتا ہوں اس کے دوستوں کو کیسے پہچان سکتا ہوں؟......" شہاب بولے۔

اشفاق کی تشویش دیکھ کر شہاب بھائی بڑی محبت سے بولے...... "کام کیا ہے؟......" "کام تو نہیں ہے صرف مفتی صاحب کا حکم ہے اور ان کا فرمان نادر شاہی ہوا کرتا ہے"۔ اب شہاب کے لئے نادر موقعہ آیا۔ وہ دوسروں کے احکامات کی اہمیت کو گھٹا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

جھٹ بولے...... "میں کراچی کا سفر گول کرتا ہوں۔ تم مفتی صاحب کے ستارے کو گول کرو۔ اور قدسیہ کو غالباً بچوں کی یاد ستا رہی ہو گی اسے گھر بھیج دیتے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو......"

"لیکن جی ہمیں تو یہاں سے اماں جی کے گھر جانا ہے مزنگ روڈ......" میں نے اپنی نرد پٹتے دیکھ کر کہا......

دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اشفاق کے چہرے پر مظلومیت چھا گئی۔

"ہاں یار...... اماں جی کے جانا تھا مجھے تو...... وہاں بخشن خاں سے بوریاں آئی ہوئی ہیں گندم کی، اگر دو چار دن ہم نہ گئے تو ساری گندم اماں جی بانٹ دیں گی ادھر ادھر...... "گندم تو ریڑھے پر جائے گی......

قدسیہ کو مزنگ چھوڑ جاتے ہیں وہاں سے داتا صاحب چلیں گے......"۔

داتا صاحب کے نام پر میں مزاحمت نہ کر سکی۔

چند دن بعد پنڈی سے ایک اور تار خط کی صورت میں آیا۔

مہارانی!

کل میں نے خواب دیکھا تھا۔

ستارہ خواب میں تھا۔

اس کے ہاتھ میں گڑھل کا پھول بھی تھا۔

ساری باتیں سچی ہیں۔

بھائی جان بھی یہی کہتے ہیں۔

مفتی

پہلے تو معمہ حل ہونے کی کوئی صورت تھی لیکن اب تو کافکا کی کہانی میں ایڈگر ایلن پو بھی شامل ہو گیا۔ ستارہ کی گواہی بھائی جان نامی کوئی غیر معروف ہستی دینے لگی اور ساری باتیں گڑھل کے پھول سمیت خواب کی تھیں اس لئے ہم جو خواب سے باہر تھے ہکابکا رہ گئے۔ میں نے اور اشفاق نے غصے میں فوراً خط لکھا کہ یہ ستارہ کھانے میں ہے' پینے میں؟ استعمال کی چیز ہے کہ سجاوٹ کی؟ اکیس سوالوں کے اندر بوجھی جا سکتی ہے کہ اس کے لئے کوئی راستے والی چیستاں ایجاد ہوئی ہے؟۔ اس مدلل انکوائری پر یہ خط موصول ہوا۔

مہارانی!

شلغم کا اچار مت بھجوانا میں خود آ رہا ہوں۔

رنگ......رنگ رنگ

ستارہ کل شام ملا تھا۔ رات گئے تک اشفاق کی باتیں ہوتی رہیں۔

مفتی

اس خط سے ستارہ نامی انڈر گراؤنڈ آدمی کا پتہ نہ چلا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ مفتی کے اکلوتے بیٹے عکسی پر ان دنوں پینٹنگ کا بھوت سوار ہے اور طبلے بجانے کی سٹیج نکل گئی ہے۔

یہ معمہ تو ایک عرصہ نہ کھلا' لیکن ایک دن اچانک مرزا صاحب آ گئے۔ مرزا صاحب جو سلٹ کی

بکری کی طرح بے ضرر چھوٹے سے پیارے سے ہیں اور جنہیں ہم عام طور پر مرزا آف کویت کے نام سے یاد کرتے ہیں' بمبئی ٹاکیز کے کامیڈین وی۔ ایچ۔ ڈیسائی کے ہم شکل ہیں اور بیک وقت حاضر و غائب رہنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی زبانی اشفاق کے دوستوں پر تبصرہ سن کر عجب لطف ملتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت حسد اور فراخدلی کا شکار رہتے ہیں۔

"کل شام مفتی ملا تھا۔ مفتی از اے حرامزادہ......کیوں بیٹا قدسیہ......؟"

"ابھی میں تصدیق نہیں کر سکی اس بات کی مرزا صاحب......"

چھوٹی سی انگشت شہادت اٹھا کر مرزا صاحب آف کویت ہنستے ہیں اور پھر چھوٹی چھوٹی آنکھیں اشفاق کی طرف موڑ کر کہتے ہیں' "یار یہ تیری بیوی کھری ہے کھری......"

"اچھا مرزا جی وہ پنڈی کا کیا حال ہے' عمر کیسا ہے؟ راجا صاحب کا کیا حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہیں حرامزادے......یار وہ قدرت اللہ شہاب کیا چیز ہے؟......"

"چیز؟...... آدمی ہے وہ تو......؟......" اشفاق نے کہا

"آدمی......؟ اس کو آدمی کہتے ہو؟......بلڈی راسکل......"

"زبان سنبھال کر بات کر مرزا......بلڈی راسکل ہو گا تو......"

"تیرے لئے تو وہ ایک بہت مفید اور اونچا افسر ہے بیٹا بیٹھو......" مرزا جی بولے لیکن یک دم مرزا کا چھوٹا سا چہرہ اور چھوٹا ہو گیا......

"یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تمہیں اور مفتی کو......"

"کیا ہو گیا ہے......"

"ادھر اس حرامزادے مفتی کی زبان سوکھتی ہے ستارہ ستارہ کہتے۔ ادھر تو کچھ بھرن بھیسن قسم کا ہو گیا ہے ذرا سی بات سن کر......"

مرزا صاحب سے کم از کم اتنی بات ضرور معلوم ہو گئی کہ جس بچے کی تلاش سارے ایئرپورٹ پر تھی وہ بچہ بالکل بغل میں کھڑا سامان کی پرچی تلاش کر رہا تھا۔ نام کے معلوم ہوتے ہی اشفاق نے شہاب کے متعلق ایک بہت تفصیلی خط مفتی صاحب کو لکھا جس میں بار بار ستارہ کا لفظ استعمال کیا اور یوں ملٹری والوں کی طرح ایبل ڈوگ چارلی شوگر قسم کی ایک اصطلاح ہمارا کوڈ بن گئی۔

جہاں تک شہاب کے لقب اختیار کرنے کا تعلق تھا ہم سب خوش تھے۔ لیکن اب جو مفتی صاحب نے اس نام کے تحت شہاب کی شخصیت میں اولیائے کرام کی صفات سے مستعار لے کر پھول پتیاں لگانا شروع کر دیں تو ہم سے برداشت نہ ہو سکا۔ سارے احکامات مفتی جی کی طرف سے آنے لگے اور ہم نے علاقائی حکومتوں کی طرح ان حکم ناموں پر خالص قسم کی عدم مطابقت کا عہد کر لیا۔

مفتی جی کا خط آیا۔

مہارانی!

اشارہ ہوا ہے

میری تنخواہ کا کیس کبھی طے نہیں ہو سکتا۔

میں مطمئن ہوں۔

مفتی

مفتی کا بغیر تنخواہ کے رہنا ہمارے لئے ایک بڑی اذیت کا باعث تھا لیکن اشارہ جو ہو چکا تھا اس لئے ہم بھی مطمئن ہو گئے۔

پھر خط ملا۔

مہارانی!

عکسی سی ایس پی نہیں کرے گا۔

ستارہ نے کہا ہے اسی میں بہتری ہے۔

مفتی

عکسی کو سی ایس پی ضرور کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس طرح ہمارے ملنے والوں میں ایک ڈی سی لڑکے کا اضافہ ہو جاتا' اور ہم جب اس کے علاقے میں جاتے تو ہماری بہت آؤ بھگت ہوتی اور چونکہ ہمیں عزت کروانے کا بہت شوق ہے اور یہ شوق اسی طور پورا ہو سکتا تھا اگر علاقہ بہ علاقہ ڈی۔ سی صاحبان سے واقفیت ہو۔

لیکن مفتی جی نے اس خواب پر بھی بہتری کی چمکیلی چادر چڑھا دی......

پھر خط ملا......

مہارانی!

سارے جسم پر پھپھولے نکلے ہیں۔

سخت عذاب میں ہوں کوئی دوا موافق نہیں آتی۔

ستارہ آیا تھا۔ کہنے لگا الرجی ہے۔ علاج چھوڑ دو۔

اب علاج کے بغیر صاحب فراش ہوں۔

جسمانی تکلیف ہے' ذہنی نہیں......

مفتی

مفتی جی کے ان خطوط نے رفتہ رفتہ شہاب کی صورت بگڑے ہوئے مسیح موعود کی کر دی۔ جو تھوڑا بہت امکان انہیں جاننے کا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پہنچے ہوئے لوگوں میں دو عیب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ لوگوں میں رہ کر اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ آپ کی پتہ نہیں کون سی رپورٹ اوپر کر دیں۔ دوسرے یہ کہ عموماً اللہ اپنے پیاروں کو آزمانے کا شوقین ہے اور ہم دونوں آزمائش سے بہت ڈرتے ہیں اگر اللہ کے چنیدہ لوگوں کے پاس رہے تو کون جانے کب آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔

شہاب کی جو تھوڑی بہت محبت اشفاق سے ملی تھی اسے مفتی جی کی عقیدت کھا گئی اور اس طرح یہ تعارف اس آئینی تعارف تک محدود رہا جو علاؤ الدین کا پدمنی سے ہوا تھا۔

اس تعارف میں دو شگاف موجود ہیں۔

ایک شگاف ماں جی کی ذات تھی اور دوسرا شگاف ثاقب ہے۔

مجھے ماں جی سے وہ ملاقات اب بھی یاد ہے جب ہم کراچی سے لاہور کا سفر کر رہے تھے۔

رات کا وقت تھا' صحرائی رات کی خنکی تھی۔ ماں جی کو غالباً اسی سردی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ کھڑکی سے پشت لگائے تسبیح پھیر رہی تھیں۔

"قدسیہ' ادھر میری سیٹ پر اپنا کاڈال دے' دو بچے ایک سیٹ پر ٹھیک نہیں' کروٹ لے کر کوئی نیچے نہ آ گرے۔"

"ٹھیک ہیں ماں جی آپ فکر نہ کریں"

"مجھے تو نیند نہیں آ رہی' انیق کو ادھر ڈال دے میری سیٹ پر"۔

"ماں جی' ان کا کیا اعتبار۔ سوتے میں آپ کا بستر نہ بھگو دیں کہیں۔"

"ادھر آ میرے پاس قدسیہ......"

میں ماں جی کے پاس جا بیٹھی۔

"جس عورت کے پلنگ پر بچہ پیشاب نہ کرے' وہ عورت بدنصیب ہوتی ہے"۔

"جی ماں جی......"

"دعا کر میرے شہاب کے گھر بھی بیٹا ہو۔" ماں جی بولیں۔ "اس کا بستر بھگونے والا بھی جلدی آئے۔"

عفت شہاب

"ضرور ہو گا ماں جی......"

"میرے شہاب میں ایک خوبی ہے وہ جو کچھ بھی مانگتا ہے دوسروں کے لئے مانگتا ہے۔ میں جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں اپنوں کے لئے کچھ نہ کچھ مانگتی ہوں۔ یہ فرق ہے...... اس میں اور مجھ میں......"

میں چپ رہی۔

"شہاب کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا وہ نہیں ہے قدسیہ......"

"جی ماں جی......"

"انیق کو میرے بستر پر ڈال دے قدسیہ، دو بجے ایک سیٹ پر ٹھیک نہیں......"

ماں جی نے وہ فرق نہ سمجھایا جو لوگوں کے سمجھنے اور اصلی شہاب میں تھا۔

وہ دعا جو ماں جی اپنے لئے مانگا کرتی تھیں وہ شہاب کے بیٹے ثاقب کے وجود میں پوری ہوئی۔ ثاقب کی تپتی آنکھیں اور اس کا گول گول وجود کبھی کبھی ایک ایسے شہاب کی نشاندہی کرتا ہے جو ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہا۔

ثاقب جب کسی آئے ہوئے مہمان کی طرف اشارہ کر کے عفت سے پوچھتا ہے "امی یہ کب جائیں گے" تو مجھے اس میں شہاب کی بیزاری نظر آتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پہلے ادیب بنایا پھر ایک ایسی نوکری پر مامور کیا جو بے سود فائیلوں پر دستخط کرنے کے سوائے اور کچھ نہیں۔ ضرورت مندوں کا ایک ایسا جمگھٹا ان کے گرد قائم کر دیا جو پشاور کے بالا حصار سے بھی مضبوط ہے۔ اتنے سفران کی قسمت میں لکھ دیئے کہ اس سکون کا فقدان ہو گیا جو بزرگوں کی میراث ہوتی ہے۔

لیکن شہاب نے اسی بیزاری پر ہلکی سی مسکراہٹ اور بردباری کا غلاف چڑھا رکھا ہے۔ اور اس غلاف کے علاوہ ایک اور غلاف بھی ہے جس میں شہاب نے اپنی گدڑی اور بنسری بھی چھپا رکھی ہے۔ جب کبھی ان کی پرواز بہت اونچی ہو جاتی ہے وہ اپنے تہ خانے میں اترتے ہیں۔ بوسیدہ غلاف کھونٹی سے اتارتے ہیں اور اس بنسری اور گدڑی کو نظر بھر دیکھتے ہیں۔ پھر تاج سلطانی اور دبدبہ قا آنی باقی نہیں رہتا اور زمین پر ننگے پاؤں چلنے والوں سے محبت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ شہاب کا سارا تحمل، مٹھاس بردباری اسی پوستین اور بنسری کی زیارت میں چھپی ہے۔ ورنہ لارنس میں بیٹھ کر گنڈیریاں کھانا، سواریوں کے تانگے میں ٹکسالی سے لاہوری گیٹ تک سیر کرنے جانا، لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر بالی جٹی کا تھیٹر دیکھنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا۔ اور پھر ان کی شخصیت میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکتی جو نیک اور بد پر لیبل نہیں لگاتی اور دوسروں کی کمزوریوں کو اپنی ترقی کا زینہ نہیں بناتی جو چشم پوشی کرتی ہے اور بھول جاتی ہے اپنے احسان بھی

اور دوسروں کی احسان فراموشی بھی۔

احسان کرنے اور احسان فراموش کرنے والوں کو بھول جانے میں عفت شہاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور یہی وہ پل ہے جو ان دونوں کناروں کے درمیان بوڈاپسٹ کے پل کی طرح ایستادہ ہے اور ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملاتا ہے۔

عفت شہاب کے ساتھ ساتھ رہتی ہے بالکل جس طرح پی آئی اے کا طیارہ دھرتی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ وہ شہاب کو اسی نظر سے دیکھتی ہے جس طرح ہوائی جہاز کی بیضوی کھڑکی سے دھرتی کا منظر نظر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ندی نالے، چوکور مستطیل کھیتوں کے ٹکڑے، ماچس کی ڈبیوں کے ڈھیر جیسے شہر، کنکھجورے سے پہاڑ اور سرمے کی لکیر سی سڑکیں۔ آسمان کی بلندی سے دھرتی کا ایک سا رنگ ہوتا ہے۔ ہلکے نیلے رنگ میں لپٹا ہوا خاکستری رنگ...... مشرقی انسان کا رنگ۔ عفت کبھی شہاب کا تجزیہ نہیں کرتی۔ وہ شہاب کو بدل کر ایک اور شہاب بنانا نہیں چاہتی۔ اس نے کبھی اس دھرتی رنگے آدمی کے شہروں، دریاؤں اور پہاڑوں کو دوربین لگا کر نہیں دیکھا۔ وہ اس مٹیالے مشرقی آدمی کا ایک ملا جلا رنگ دیکھتی ہے اور اس رنگ پر اس لئے اعتماد کرتی ہے کہ اس رنگ سے روئیدگی کا پیام ملتا ہے۔ اس سے رحم کی خوشبو آتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک رات جب شہاب ٹوپی پارک میں مقیم تھے میں ان کے گھر گئی تھی۔ اکتوبر کا آغاز تھا۔ ان کے پچھلے برآمدے میں جہاں مکان سے قدرتی ڈھلوان شروع ہو کر دور وادی تک کا منظر نظر آتا تھا۔ اسی برآمدے میں رات گئے تک میں اور عفت بیٹھے شہاب کا انتظار کرتے رہے۔

بالآخر عفت نے کہا...... "ایک ہی آدمی میں اتنی صبر آزما خاصیتیں نہیں ہونا چاہئیں۔ انسان اس کا ساتھ دیتا دیتا تھک جاتا ہے......"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی......" میں نے پوچھا......

عفت نے لمبی سانس لی اور بولی...... "دراصل شہاب قصوروار ہوتے ہیں۔ لیکن ان پر غصہ اس لئے نہیں آ سکتا کہ قصوروار ہونے کے باوجود قصور ان کی ذات کو ملوث نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے غافل ہوتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ مجھ سے غافل ہیں۔ ایسے آدمی کو کوئی کیا کہے جس کا ہر بہار میں ہر گھڑی میں ایک سا رنگ رہتا ہے" ایسے آدمی کی شاید ایک ہی خوبی ہوا کرتی ہے۔ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور عفت شہاب پر اعتماد کرتی ہے جس طرح کسی زمانے میں چین کے لوگ اپنی دیوار پر بھروسا کرتے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرا شہاب سے ابھی تک تعارف نہیں ہے۔ میں نے تو فقط فیشن کے تحت مضمون لکھنا قبول کر لیا تھا۔

میں نے شہاب کو ان تین کنواریوں کی آنکھوں سے دیکھا جو دلہنیں بنی ہاتھوں میں مہندی رچائے بیٹھی رہیں اور جب مسیحا کی برات آئی تو وہ تینوں سوتی رہیں اور دولہا چلا گیا۔ میں نے انہیں اس اشفاق کی آنکھ سے دیکھا جو اپنی ہر محبت پر اپنی ہی مہر لگا کر اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔ میں نے انہیں اس جگت گرو مفتی جی کی نظر سے دیکھا جو سولڈر کرنے والوں کی عینک چہرے پر لگائے شہاب کی شعلہ رو شخصیت دیکھتا رہ گیا۔ میں نے انہیں عفت کی نگاہ سے دیکھا جو ایک ڈاکٹر کی نگاہ ہے۔ مجھ میں ابھی وہ ضبط و انتظام موجود ہے جو اندھے شیشے کی طرح ہوتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے نہ کسی اور کی شخصیت کے پرت کھلتے ہیں نہ اپنی حد کا پتہ چلتا ہے۔

میرے لئے شہاب اجنبی ہیں۔ میں سہ پہر کا وقت ہوں اور وہ دوپہریا کا پھول ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے وہ پر قینچ کبوتر کی طرح سہمے رہتے ہیں۔ ان کا چہرہ سیکرٹ ایجنٹوں کی طرح واٹر پروف رہتا ہے اور اس چہرے تلے سوچ کی گھڑی کس طرح چلتی ہے اس کی کچھ خبر نہیں ملتی۔

لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اشفاق کے جملہ حلقہ بگوشوں کی طرح کسی روز شہاب بھی دلگیر سے ہو کر مجھ سے اشفاق کی بے التفاتی کا ذکر کریں۔ اپنے گھریلو جھگڑوں کی گتھیاں کھولیں۔ اس عہد کا ذکر کریں جب انہیں پہلی بار عشق ہوا تھا اور انہوں نے دھتورے کا دودھ نکال کر پینے کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر میں بڑی اونچی بن کر کہوں...... "شہاب بھائی، دراصل آپ اونچی جگہوں سے خوفزدہ ہیں۔ دوستوں کی آپ سے بے التفاتی اس بات کی مظہر ہے کہ آپ کے بچپن کی الجھنیں ابھی ناشگفتہ حالت میں آپ کے اندر Octupus کی صورت زندہ ہیں۔ آپ کے گھریلو جھگڑے معمولی ہیں صرف آپ کی اذیت پسند طبیعت اس طرح کے اعجاز تعمیر کرتی رہتی ہے تاکہ آپ جنسی آسودگی محسوس کر سکیں۔ آپ کا پہلا عشق اتنا اہم نہیں جتنا آپ اسے سمجھ رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ محبوس پرندے کی طرح خود ترسی کا شکار ہیں۔ اور اس خود ترسی سے اور کئی چشمے نکلتے ہیں......"۔

ابھی تک یہ وقت نہیں آیا ورنہ میرا مضمون زیادہ دلچسپ ہوتا اور آپ اس شہاب کو بہتر طور پر جان سکتے جس نے اپنے چہرے پر ماسک پہن رکھا ہے اور ماسک پہننے کے بعد اسے اتارنے کا ڈھنگ بھول چکا ہے......"

قریباً اٹھائیس سال پرانا یہ مضمون میں نے فقط اس لئے شامل تحریر کیا ہے کہ آپ کو یقین دلاؤں اس لمبے عرصے میں گو ہمارے مراسم بڑھے، ہمیں ان کے ساتھ زیادہ وقت ملا۔ لیکن شہاب بھائی کے تعارف میں اضافہ نہ ہوا۔ پہلے سنی سنائی پر شناخت موقوف تھی۔ اب حوالے بدل گئے ہیں لیکن گیان میں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ میں نے مفتی جی، خان صاحب اور عفت کی عینک لگا کر انہیں دیکھا۔ اب دیکھنے کے زاویئے بدلے ضرور ہیں لیکن ناواقفیت کا وہی عالم ہے۔

کسی شخص کے قریب ہونے کا ماڈرن گُر اظہار ہے۔ آپ اپنی کہیں اور دوسرے کی سنیں' افہام و تفہیم ہو' ڈائیلاگ چلے' نظریے سمجھے جائیں اور اظہار کے دوران سمجھ میں آنے لگے کہ فلاں شخص کیا سوچتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کی آرزوئیں کیا ہیں؟۔ وہ آپ سے کیا توقعات وابستہ رکھتا ہے؟...... اظہار ہی کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شخص جس سے آپ واقفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں آپ کے مطلب کا آدمی ہے بھی یا نہیں۔

ممتاز مفتی اور یو این او افہام و تفہیم کے دو ادارے ہیں۔

مفتی جی کو گونگے لوگ پسند نہیں اور اللہ کی کرنی کہ وہ قدرت اللہ شہاب سے وابستہ ہو گئے۔ جو بالکل اظہار کے بندے نہ تھے۔ دس اگست ۱۹۶۹ء کو نوٹنگھم سے شہاب بھائی نے مجھے ایک خط لکھا۔ مفتی جی کی ضخیم کتاب "علی پور کا ایلی" کا دوسرا ایڈیشن آرہا تھا اور اس کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ شہاب بھائی نے اپنے خط میں مفتی جی کے بارے میں جو کچھ لکھا اسے رقم کرتی ہوں......

"اگر علی پور کا ایلی واقعی ممتاز مفتی ہے تو پھر وہ نوجوان بوڑھا کون ہے جو ننھے بچوں کا گھوڑا بن کر گھٹنوں تک گھٹنوں کے بل رینگتا رہتا ہے؟۔ وہ نحیف و نزار انسان کون ہے جو ایک آدمی...... ایک عورت نہیں...... ایک آدمی سے محض سرسری سی' محض فروعی سی ملاقات کا وعدہ وفا کرنے کے لئے کڑکڑاتی ہوئی سردی اور موسلا دھار بارش میں ایک ناقابل اعتماد پھٹیچر سے بائیسکل پر اندھیری رات میں سولہ میل جانے اور سولہ میل آنے کا تعب یوں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے جیسے آتشدان کے سامنے بیٹھا بائیں ہاتھ سے چٹکی بجا رہا ہو...... وہ عیش پسند درویش جو تمباکو والے چند پان کھا کر اور چائے کے چار پیالے پی کر زندگی کے صبح و شام بڑی تن آسانی سے گزار دیتا ہے؟۔ وہ ایذا طلب سنیاسی جو حج کے لئے رخت سفر باندھتا ہے تو احرام کی مدت کے لئے تمباکو والے پانوں کی لذت کو بھی یوں ہی بلاوجہ تیاگ دیتا ہے؟ وہ بے راہ رو حسن پرست جسے مکہ اور مدینے میں کالی آنکھوں اور سنہری بالوں والی کندن کی طرح دھکتی' تانبے کی طرح دمکتی اور گلاب کی طرح مہکتی' شامی' ترکی' مصری اور حجازی عورتوں کی قطاروں کی قطاریں ایک بار بھی نظر نہیں آئیں؟...... وہ اڑیل ساہٹ دھرم ضدی بندہ جو اپنے اللہ کے سامنے بے نیاز اور اپنے رسولؐ کے حضور عاجز ہے......

بانو قدسیہ' دراصل یہ سوالات میں یونہی بلاوجہ اور بے ضرورت پوچھ رہا ہوں...... شاید محض زیب داستان کے لئے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ جب میں پہلے پہل ممتاز مفتی سے ملا تو میں نے

فوراً فیصلہ کر لیا کہ بس یہ آدمی ضرور میرے ڈھب کا ہے۔ گرمجوشی وہ جیسے گندھک کا ابلتا چشمہ' سرد مہری ایسی گویا جما ہوا گلیشیر' نرمی میں روئی کی بتی جو مدت سے مٹی کے دیئے میں سرسوں کے تیل میں گری پڑی ہو' سختی میں نائی کا استرا' مٹھاس کا موڈ ہو تو رس کا گھڑا اور نہ نرا پرا روکھا پھیکا کھدر سا لاتعلق انسان جو اپنے دل کی کڑوی سے کڑوی لیکن سچی بات یوں کہہ گزرتا ہے جیسے موسم کا حال بیان کر رہا ہو۔ یہ تو بھلا ہو افسانہ نگاری کا' کہ اس فن نے ممتاز مفتی کو بیان کا وہ اعجاز عطا کر رکھا ہے کہ اس کی ہر حقیقت پر افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے اور ہر افسانے پر حقیقت کا...... اگر فن کا یہ چور دروازہ ممتاز مفتی کو راہ نہ دیتا تو اب تک وہ کبھی کا جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ماخوذ ہو کر کیفر کردار تک پہنچ چکا ہوتا یا کاد کا راہ گیروں کو پکڑ پکڑ کر گھیر گھار کر بڑی منت سماجت' بڑی لجاجت سے نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتا اور اگر کوئی سادہ لوح مسافر اس کی باتوں میں آکر باقاعدہ وضو کر کے نماز کی نیت باندھ بھی لیتا تو ممتاز مفتی نہایت بے اعتنائی سے سگریٹ سلگا کر الگ تھلگ بیٹھ جاتا اور دل ہی دل میں تعجب کرتا کہ اللہ کی بھی کیا شان ہے کہ ابھی تک ایسے ایسے اچھے اچھے لوگ موجود ہیں جو ہنسی خوشی نماز تک پڑھ گزرتے ہیں!......

یہ بات نہیں کہ ممتاز مفتی کسی قسم کے عقیدے میں گرفتار ہے۔ وہ تو ایک ایسا آزاد منش ہے جو عقیدے کا روگ پال ہی نہیں سکتا۔ اس کے سارے وجود میں عقیدہ نہیں بلکہ عقیدت جاری و ساری ہے۔ عقیدت بھی وہ جس میں حدت بھی خوب' شدت بھی خوب اور جدت بھی خوب! اب اس عقیدت کا شکار کون ہوتا ہے اس کا دارومدار یا حسن اتفاق پر ہے یا محض حادثے پر...... اگر عورت ہے تو جنس' دوست ہے تو محبت' دشمن ہے تو نفرت...... اور جب کسی وقت ممتاز مفتی کی عقیدت کے جال میں نہ عورت پھنسی ہوئی ہو' نہ دوست اور نہ دشمن تو وہ اچانک راہ چلتے چلتے کسی میرے جیسے لاوارث کو آنکھ بچا کر اٹھا لیتا ہے۔ اسے گود میں بٹھاتا ہے' کندھوں پر اٹھاتا ہے' کھلاتا ہے' پلاتا ہے' پالتا ہے' پوستا ہے' بال بڑھ جائیں تو کٹواتا نہیں بلکہ لانبی لانبی زلفوں پر گوٹے کناری والا سبز ململ کا صافہ باندھ دیتا ہے۔ داڑھی نکلے تو اس پر مشک کافور کی ٹکیاں سجا دیتا ہے' آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ لگا دیتا ہے اور پھر اسے میدان میں نکال کر با آواز بلند کہتا ہے "کہ ہاں بچہ جمورے تمہارا نام کیا؟...... تمہارا کام کیا؟...... تمہارا دام کیا؟"

بہ امر مجبوری بچہ جمورا صحیح جواب دیتا ہے لیکن اگر کوئی جواب ممتاز مفتی کی عقیدت کے سائے میں پورا نہ اترے تو وہ اندر ہی اندر اسے ایسے خفیہ گھونسے مارتا ہے کہ بے چارا بچہ جمورا

بس، وہی تکنے لگتا ہے جو ممتاز مفتی کی عقیدت چاہتی ہے کہ وہ کہے......

عقیدت کے میدان میں ممتاز مفتی وہ خرکار ہے جو معصوم بچوں کو اغوا کر کے ان کی انگلیاں توڑتا ہے' ان کی ہڈیاں مروڑتا ہے تاکہ وہ اس کے اور صرف اس کے سانچے میں فٹ ہو سکیں۔ شریعت میں وہ خاموش ہے کیونکہ اسے اپنے رسولؐ سے ایسا انس ہے جو شاید ضرورت کے بغیر بھی مچھلی کو پانی سے ہونا چاہئے...... طریقت میں وہ بے شک بڑا طرحدار ہے' اگر تصوف میں غنڈہ ایکٹ نافذ ہوتا تو ممتاز مفتی دائمی ضمانت پر زندگی گزارتا...... مرنے کے بعد اگر وہ جنت میں گیا تو شاید اسی وجہ سے جائے کہ آخر وہاں کی جیلیں بھی تو کسی نے آباد کرنی ہیں۔

یوں روزمرہ کی زندگی میں ممتاز مفتی سرکس کا "سانٹے مار" ہے۔ وہ ہر وقت لنگر لنگوٹ کسے' بدن پر تیل ملے' سدھے سدھائے ہاتھیوں اور بندھے بندھائے شیروں کو سانٹے مار مار کر مزید سدھارتا اور مزید باندھتا رہتا ہے۔ "علی پور کا ایلی" اسی سرکس کی ایک جھلک ہے۔"

اس خط سے ممتاز مفتی کی جو جھلک آپ نے دیکھی اس میں اضافے کے لئے ایک اور خط کا حوالہ پیش کرتی ہوں......

۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء

بانو بہن!

بورڈ کی میٹنگ میں ایک خوبصورت سی لڑکی نے ابھی ابھی آپ کا خط مجھے لا کر دیا ہے۔ پتہ نہیں کس کا شکریہ ادا کروں۔ فی الفور جواب لکھ رہا ہوں۔

مفتی جی کی باتوں پر زیادہ نہ جائیے، وہ بڑے آدمی ہیں۔ بڑے ہیں کیونکہ نر آدمی ہیں۔

مجھے نہ پیری پسند ہے نہ فقیری۔ میں تو محض ایک سیدھا سادا سا عیش پسند انسان ہوں۔ جب عیش میسر ہو تو اللہ کا احسان ہے جب نہ ہو تو بھی اس کی دین ہے۔ پتہ نہیں کس طرح...... لیکن کسی طرح کھینچ کھانچ کر اب میں اس منزل تک پہنچ گیا ہوں جہاں مدح و ذم یکساں ہیں۔ اس منزل میں میری واحد آزمائش مفتی جی ہیں۔ وہ چابک مار مار کر حکم دیتے ہیں کہ اپنی تعریف سنو اور خوش رہو۔

میں تعریفیں...... سنتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں...... لیکن جب کوئی میرے خلاف کچھ کہتا یا کرتا ہے اس پر بھی واللہ رنجیدہ نہیں ہوتا۔

آپ کا بھائی

قدرت اللہ شہاب

یہ دونوں خط رقم کرنے سے میری مراد یہ تھی کہ آپ خود دیکھ لیں کہ اظہار کس قدر بڑا حجاب ہے۔ مفتی جی اور یو این او کی پالیسی کتنی الجھا دینے والی ہے۔ شہاب بھائی نے جتنی خوبی سے مفتی جی کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے اس سے کہیں زیادہ چابکدستی سے اظہار ہی کا سہارا لے کر اپنی ذات پر پردہ ڈال گئے ہیں۔ شہاب بھائی سے قدرت اللہ شہاب کی باتیں کرنا ایسے ہی تھا جیسے دائروں میں گھومنا' اندھیرے میں ٹٹولنا' زیر آب تیرنا' ہجوم میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا جو گروہ میں موجود ہی نہیں۔

گو اظہار کا وسیلہ اور افہام و تفہیم کا اصول شہاب بھائی کو جاننے میں مدد نہیں دے سکا۔ لیکن مفتی جی پکے پکے ادیب ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا سونا جاگنا سب لفظ ہے۔ وہ جب بھی سوچتے سمجھتے جانتے ہیں لفظوں کا سہارا لیتے ہیں اسی لئے ان کے اور میرے درمیان ایک عرصے سے صرف تین لفظ زندہ ہیں۔

قدرت اللہ شہاب......!

ہم دونوں پہلے اس موضوع پر اتفاق کرتے ہیں پھر جھگڑتے ہیں۔ مفتی جی کبھی مجھے حلقہ ارادت سے نکال پھینکتے ہیں کبھی دلار سے دوبارہ دوزانو ہونے کا حکم دیتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب مفتی جی کی ملکیت' ان کا مسلک' نظریہ' آنگن' تکیہ' چوپال' گھر' وجہ زیست سب کچھ ہے۔ میں ناری ہوں دنیا سے بندھی ہوں اولاد پالنے کے فریب میں مبتلا ہوں۔ پتی بھگتی کو دھرم سمجھتی ہوں۔ میرے لئے راستے کے کئی حجاب ہیں۔ مفتی جی کو ان چلمنوں سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ مجھ جیسی عارف دنیا کو عارف مولی بنانے میں کچھ اس درجہ اصرار اور شدت برتتے ہیں کہ میں بدک جاتی ہوں اور مفتی جی کو اپنی قرولی اپنی نیام میں واپس دھرنی پڑتی ہے۔

جن دنوں شہاب بھائی باتھ آئی لینڈ میں مقیم تھے اور اسکندر مرزا کے سیکرٹری تھے ہم غریب نادار میاں بیوی کئی رضائیاں گدے لپیٹ تبت کا بسترا ہول ڈال میں باندھ کراچی گئے تھے۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوئی اس کی روئیداد آپ پڑھ چکے ہیں۔ مفتی جی نے وہیں خان صاحب پر یہ الزام لگایا کہ اشفاق افسر باز' اقتدار پسند اور جھولی چک آدمی ہے...... کراچی ہی کے قیام میں مجھ پر صرف اتنا کھلا کہ شہاب بھائی بڑے جھینپو' کم گو' شرمیلے اور ہلکے ہلکے سے بے ضرر شرارتی آدمی ہیں۔

کراچی کے بعد کئی سال مفتی جی سے شہاب صاحب کی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ جوں جوں ان کا تعلق شہاب صاحب سے مضبوط ہونے لگا مفتی جی کو خوش کرنا مشکل کام بنتا گیا۔ مفتی جی بڑے روایتی مہمان نواز ہیں۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں غیر مقلد اور بے پروا سمجھیں۔ وہ ایک عرصہ تک صبح و شام شہاب بھائی کو پان لگا کر دینے جاتے رہے۔ ہم اسلام آباد جاتے تو مفتی جی پڑیوں میں پان لپیٹ کر خان کو بھی دینے آ جاتے۔ اس دستوری پر اگر ہم شکریہ ادا کر بیٹھتے تو مفتی جی کہتے...... "اوئے بلئے ہم سے خاطر داریاں نہیں ہوتیں' دنیاداریاں نہیں نبھتیں"۔

مفتی جی کو اپنے دوست بڑے پیارے ہیں۔ پر وہ ان دوستوں کی کج ادائیاں برداشت نہیں کر سکتے۔ جتنا ان کا تعلق گہرا ہوتا ہے اسی قدر وہ دوست کو اپنے دست قدرت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ دوست اپنی مرضی 'طبیعت' مسلک' حالات' عمر کے تقاضوں کے تحت فعال نہیں ہو سکتا۔ دوست کو ہرگز ہرگز یہ اجازت نہیں ملتی کہ کبھی کبھی وہ بھی کمینہ' **غضیل** 'احمق 'جھوٹا' دل پھینک' **غیبت** باز اور بے فیض ہو جایا کرے۔ شہاب بھائی کے قرب نے مفتی جی میں انسانی کمزوریوں کے لئے حوصلہ کم کر دیا ہے اِن کے پاس جب سے سونے کا گز آیا دوستی کی ساری بزازی فیل ہو گئی اب تمام دوست کوئی گرہ کم ہے کوئی انچ زیادہ جونہی مفتی جی محسوس کرتے ہیں کہ فلاں دوست ان کے گز پر ناپنے کے قابل نہیں وہ اپنی **چھیٹیوں** کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ پہلے القاب بدلتا ہے پھر تحریر میں تو سے آپ کا تکلف شروع ہوتا ہے۔ دوست ان تنبیہی خطوط کے باوصف پھر بھی چھوٹا' دنیادار اور کمزور رہنے پر مصر رہے تو مفتی جی اسے بیک بنی اور دو گوش آنگن بدر کر دیتے ہیں۔ اور پھر دل ہی دل میں سوچتے ہیں کمال ہے اتنی چھوٹی سی بات نہیں سمجھتا آخر شہاب بھی تو ہے..... کیا آدمی ہے کیا بات ہے؟۔

سونے کے گز سے سب سے زیادہ نقصان' بے قدری' حق تلفی عکسی مفتی اور اشفاق احمد کی ہوئی۔ یہ دونوں مفتی جی سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں کہ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مفتی جی کے بے نوک عتابی خط پا کر مضمحل ہوتے ہیں۔ لیکن اپنا آپ بدل نہیں سکتے۔ عکسی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کا باپوا سے سونے کے گز سے کیوں ناپ رہا ہے۔ خان سمجھ تو جاتے ہیں لیکن مفتی جی کی اس بے سمجھی پر ان کا اختیار نہیں چلتا۔ عکسی مفتی اور اشفاق احمد کی تو فقط اتنی خواہش ہے کہ مفتی جی بس انہیں بونے سمجھ کر آنگن میں اچھل کود منانے دیں ہر درخت کی ڈالی پر چڑھ کر ایک ہاتھ سے ڈالی پکڑ کر زور سے ہلائیں اور کہیں "لک مفتی جی نو ہینڈز..... نو ہینڈز..... " لیکن مفتی جی نہ تالی بجاتے ہیں نہ خوش ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کا ایک اور بیوروکریٹ سے مقابلہ کرتے ہوئے دل میں زچ ہو کر کہتے ہیں "فیوڈل لارڈز..... بیوروکریٹ..... **کملس** ..... شو آف..... **سیلف** میڈ بونے"۔

قیام پاکستان کے بعد جو پود بڑے شہروں میں پناہ گزین ہوئی ان لوگوں میں جواں سالوں پر عجیب اثر ہوا۔ وہ مسائل سے نپٹتے نپٹتے جوں توں اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور جونہی انہیں اپنے دست و بازو پر اعتماد پیدا ہوا ایک پوری کھیپ **سیلف** میڈ افسر کلاس' بزنس مین' شاعر' ادیب' ایکٹروں' ڈاکٹروں کی پیدا ہو گئی۔ پاکستان میں ہر پروفیشن میں جو لوگ بالکل چوٹی پر نظر آتے ہیں وہ عموماً **سیلف** میڈ ہیں۔ عکسی مفتی اور خان صاحب بھی **سیلف** میڈ ہیں۔ ان میں اور شہاب بھائی میں ایک بنیادی فرق یہ بھی تھا۔ شہاب بھائی کبھی میڈ تھے ہی نہیں۔ وہ پری میڈ آئے تھے انہوں نے دنیاوی اعتبار سے کبھی کچھ کرنے' بننے' آگے بڑھنے' پیچھے رہ جانے' جھنڈا گاڑنے' متاثر ہونے یا کرنے کے لئے اصرار یا تلاش نہ کی تھی۔ وہ بس پیدل مسافر کی طرح چھڑی کے سرے پر روٹی کی پوٹلی باندھے چلتے رہتے تھے جو کچھ راستے میں

آ جاتا' کر گزرتے۔ چاہے یہ آئی سی ایس کا امتحان ہوتا یا چندراوتی کی کثافت بھری بوریاں ڈھونا..... چاہے یہ اسرائیل کا سفر ہوتا یا ہیگ کی **ایمبسڈری**..... وہ تلاش' اصرار' تجویز' اہتمام کے بغیر' جو بھی کام ہر دوست ہر تا توجہ' خوش دلی اور محبت سے کر دیتے۔ جس قدر کام لاتعلقی سے کرتے اتنا ہی وہ مدح و ذم کے چکر سے نکل جاتے۔ "شہاب نامہ" پبلک میں عام ہونے سے پہلے انہوں نے پردہ کر لیا تاکہ اس سے حاصل ہونے والی تعریف ان میں مدح کا اشتیاق پیدا نہ کر دے۔

برصغیر میں عموماً چار خوبیاں یکجا ہوں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے ورنہ اپنا آپ منوانے کے لئے تقابل کے بیلنے میں اپنی ہی بانہہ ڈال کر محنت کا رس نکلوانا پڑتا ہے۔ اگر انسان امیر ہو' انگریزی کے لہجے پر عبور ہو' گورا چٹا' خوبصورت اور اونچی ذات والا کہلائے تو ان چار خوبیوں کے باعث ہمارے معاشرے میں وہ اڑتا سانپ بن سکتا ہے' اگر دو ایک کوائف کم ہوں تو گھٹتی لڑتا ہے اور اپنے آئی کیو اور محنت کا سہارا لے کر **سیلف** میڈ آدمی بن جاتا ہے..... ہمارے معاشرے میں ایک مدت سے اپنی بڑائی کے یہ چار تعویز کام آتے رہے ہیں۔ جس شخص کے پاس ان کی کمی ہو اس کی عزت ہمارے معاشرے میں بحال نہیں رہ سکتی۔ فقط متقی' پرہیزگار' بے ضرر انسان ہو تو ہمارے معاشرے میں لوگ اسے ایویں کھویں ہی سمجھیں گے۔

سیلف میڈ آدمی کی آتش بازی احساس کمتری کی تیلی سے سلگتی ہے اور مسالہ ختم ہونے کے بعد بھی شعلے جھاڑتی رہتی ہے۔ مسٹر **سیلف** میڈ زندگی میں اتنی ٹھوکریں' کشمکش' مشکلات' زیادتی' دھاندلی' نکتہ چینی سہہ چکتا ہے کہ اس ٹین کے کنستر میں چب پڑ جاتے ہیں۔ جیسے وہ اونچے پہاڑ کے پتھروں سے ٹکراتا آیا ہو..... **سیلف** میڈ ایک خاص ڈھب کا آدمی ہوتا ہے کیونکہ اس کی بنیادی پرورش بڑی روایت پسند' سادہ مرادی عورت نے کی ہوتی ہے جو اسے چھوٹوں سے پیار' بڑوں کا ادب' ماں کے پاؤں تلے جنت' عورت کا ڈولی میں آنا اور کندھوں پر جانا وغیرہ وغیرہ قسم کے نظریات کی چھاؤں تلے پالتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ترقی کی دیوی وقت اور پوزیشن کے ساتھ ساتھ اسے فقط Information oriented بنا دیتی ہے۔ ماں کے نظریات پر اس کا ایمان نہیں ہوتا اور انفریمیشن اس کا حال نہیں ہوتی۔ اس نظریاتی دورخی کے باعث **سیلف** میڈ لوگ عموماً دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک ان کا خود مختار **سیلف** ہوتا ہے۔ جسے پروفیشن میں کامیابی مانجھا چڑھاتی ہے اور ایک ان کے اندر کا **برائلر** چوزہ جو ہر بجلی کے بلب کے پاس جا کر اس لئے رک جاتا ہے کہ اس میں اسے عافیت' گرمی اور مامتا نظر آتی ہے۔ **سیلف** میڈ آدمی کی مشکل یہ ہے کہ اپنے دو **سیلف** لے کر دو راستوں پر چلتا ہے اور یہ راستے کہیں نہیں ملتے۔ وہ فل لوڈڈ کار میں انگریزی موسیقی بھی سنتا ہے اور فوک کلچر میں بھی اس کی جان پھنسی رہتی ہے۔ دانشوری کے تمام ہتھکنڈوں سے لیس ہو کر جنگ بہر صورت وہ معصومیت کی جیتنا چاہتا

ہے۔ دن بھر جب یہ کاغذی شیر آرڈر دیتا، آگے بڑھتا، مشورے پھینکتا، جھڑکیاں سناتا، کافی ٹینشن حاصل کر لیتا ہے تو اپنی سوگوار شام میں کسی کلب، ڈاکٹر کے کلینک، ٹی وی کے آگے، چوری کے معاشقے، ہاٹ واٹر باٹل، بچوں کی خوشامد، ٹرانکولائزر، احساس جرم کے حوالے کر دیتا ہے۔ جب ان سہاروں سے بھی تھپکی نہیں ملتی تو سردیوں کی رات کے پچھلے پہر وہ دکھوں کا کمبل ذرا سا چہرے سے اٹھا کر کہتا ہے۔

تاروں والی رات کے نیچے جاگتے جاگتے رات کٹی
دن نکلا تو کارجہاں کو جوں توں بھی اپنانا ہو گا
شمع کا چہرہ زرد ہوا ہے خاک پہ رکھو پیشانی
کہہ دو ورد دیا تو داتا درماں بھی بتلانا ہو گا

مفتی جی سچے کھرے اور محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ انہیں کسی سیلف میڈ آدمی پر زیادہ دیر محبت نہیں آتی۔ وہ مور کا ناچ دیر تک دیکھ نہیں سکتے لیکن شہاب بھائی لک مانو ہیڈیز والے انڈر ڈوگ بھرن مچھن کمزور سیلف میڈ آدمی کے ساتھی تھے۔ شہاب بھائی تمام بیواؤں اور یتیموں کے دل سے ہمدرد تھے۔ انہیں کمزور آدمی کی بیساکھی بننے کا شوق تھا۔ شرابی، لپاٹیا، راندہ درگاہ ان کے نزدیک ہمدردی کا مستحق تھا۔ اپنے سے مختلف مسلک والے کی ان سے خوب بنتی تھی۔ وہ اختلاف اور تضاد کے باوجود ہمدردی بانٹ سکتے تھے۔ محبت کر سکتے تھے۔

اسی لئے پہلی نظر میں انہوں نے سیلف میڈ عکسی مفتی کا انتخاب کیا اور ہمیشہ اپنی محبت کی لوئی سے اسے ڈھانپے رکھا۔ وہ جب بھی عکسی کی بات کرتے ان کا لہجہ مامتا سے بھیگا ہوتا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عکسی بیوہ بھی ہے اور یتیم بھی...... بیوہ وہ اس لئے تھا کہ بے سہارا تھا اور یتیم وہ اس ضمن میں تھا کہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا باپ کی شکل ایسے ہی دیکھتا تھا جیسے جہلم کی پٹیاں ماؤنٹ ایورسٹ کو دیکھتی ہیں اور اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔

ان دنوں ہم ماڈل ٹاؤن میں سرکلر روڈ سے کچھ پیچھے ہٹ کر جی۔ ۷۵ میں رہتے تھے۔ عکسی نیا نیا چیکوسلواکیہ سے ہو کر آیا تھا۔ اس کی آواز میں امید، چال میں ہمت اور پروگراموں میں جذبہ تھا۔ لیکن نوکری کہیں آس پاس نہ تھی۔ عکسی بیس پچیس دن ہمارے پاس رہ کر جب چلا گیا تو مجھے خوف آنے لگا۔ وہ اتنا پرامید اور مغربی نظر آ رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہیں ہمارے مشرقی ماحول میں اس کا مستقبل مخدوش نہ ہو جائے۔ ان ہی دنوں عفت اور شہاب بھائی ہمارے گھر آئے۔

چھوٹے سے کھانے کے کمرے میں، جہاں گلابی پردوں کی روشنی میں عفت کا چہرہ عنابی شہابی لگ رہا تھا میں نے کچھ جھجک کر عکسی کی بات کی۔ شہاب بھائی کی آواز چہرہ ہاتھ سب ماں کے بن گئے وہ پریم بھری آواز میں بولے...... "آپ فکر نہ کریں عکسی کے لئے ہو رہا ہے"۔

"کیا شہاب بھائی؟"

عکسی مفتی، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی
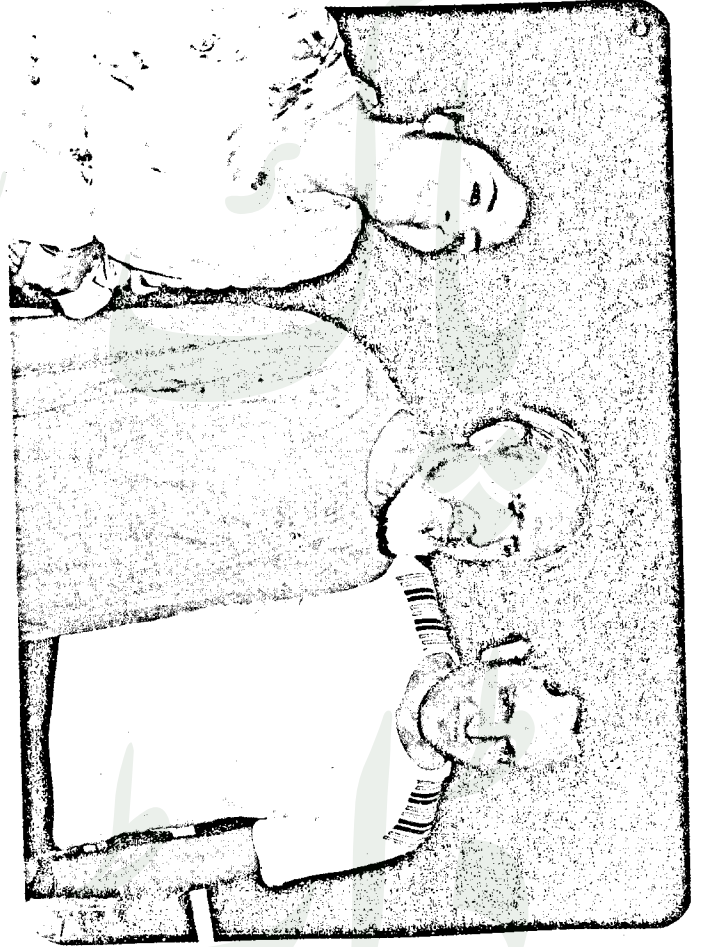
"بس ہو رہا ہے......"

"کیا آپ نے کہیں سفارش کی ہے؟"

"نہیں......"

"کیا آپ کہیں سفارش کریں گے؟"

"نہیں"۔

بھلا جب سفارش نہ کی گئی اور نہ ہی کرنے کا ارادہ ہے وہاں کام کیسے بنے گا میں نے ان سے پوچھا...... "کیا آپ کے دفتر میں جگہ ہے؟"

"نہیں......"

"تو پھر شہاب بھائی عکسی کا کیا ہو گا؟"

"بس آپ فکر نہ کریں...... ضرور کچھ اچھا ہو گا"

اس لمبے اصرار پر خان صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں چپ ہو گئی۔ تب مجھے معلوم نہ تھا کہ شہاب بھائی اسی طرح مدد کرتے ہیں۔ نہ وہ فائل چلاتے' نہ کسی سے سفارش کرتے' نہ اپنے عہدے کا دباؤ ڈالتے' کسی دوستی رشتے داری کا حوالہ بھی نہ دیتے...... بس وہ کسی اور درگاہ میں کسی اور حضوری میں اپنی کالی صندوقچی میں درخواست بند کر کے لے جاتے وہاں کی منظوری کے بعد دنیا خود بخود صاد کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ شہاب بھائی جب کسی کے خیر خواہ ہو جاتے کسی پر اپنی نظر کی ردا ڈال دیتے اِس کے لئے خیر خواہی کا جذبہ محسوس کرنے لگتے تو پھر ان کی خواہش سے ہی احکامات جاری ہو جاتے' کام بننے لگتے' حالات سدھرنے لگتے۔ وہ چاہے انشاء جی ہوں' خان صاحب کا گھرانہ ہو' مفتی جی کے گھر والے ہوں' شیما مجید کا نحیف وجود ہو...... اثیار راعی ہو' جمیل الدین عالی ہوں...... بریکیں کھل جاتیں' راستے ہموار ہو جاتے' سب کی گاڑیاں اپنے اپنے پٹرول سے چلنے لگتیں۔

شہاب بھائی کی دعا کو روئیدگی' پرورش اور برکت سے گہرا تعلق تھا۔ ایک آشیرباد ملتے ہی ہولے ہولے نامعلوم طریقے سے نامحسوس انداز میں بانجھ درخت پھل لانے لگتے۔ بیلیں ہری ہو جاتیں...... خشک ان ڈور پلانٹس میں نئے سرے سے پتیاں نکل آتیں' انگوروں کی بیل میں پھل زیادہ آتا' میگنولیا کے پودے کو پھول بے تحاشا لگتے...... کبوتروں کے بچے کوے اڑا کر نہ لے جا سکتے' لان کے خشک حصوں میں خود بخود سبزہ پھیلنے لگتا...... روئیدگی کا لمبا سلسلہ چل نکلتا۔

توجہ کی نگاہ پڑ جانے پر آپی آپ نوکری کے پروانے آ جاتے...... گھر کے لئے بغیر چکر لگائے قرضہ مل جاتا...... بیٹی کے رشتے کی بات پکی ہو جاتی...... گودیوں میں بیٹے پوتے آ جاتے...... ہسپتال سے بھلی خبر آتی...... اچانک پرائز بونڈ نکل آتا...... چوری کا سامان چور گھر چھوڑ جاتے...... کم تنخواہ پر اچھا ملازم مل

جاتا...... قالینوں پر ہم خیال دوست آ کر بیٹھنے لگتے...... خوشخبری کا سلسلہ پھیل جاتا۔

شہاب بھائی مائل بہ کرم ہوتے تو میزوں پر پھل' گلاسوں میں دودھ' چھابے میں روٹیاں بچنے لگتیں' بجلی کا بل کم آتا' گریڈ اور پنشن زیادہ ہو جاتی' بنکوں میں پیسہ بڑھ جاتا' ٹرانسفر خود بخود رک جاتی...... سرکاری خرچ پر بیرون ملک سفر طے پا جاتا...... بیٹھے بٹھائے بیوی اچھی لگنے لگتی اور اس کے رشتے داروں پر ترس آنے لگتا...... بازاروں میں دکاندار کو کا کولا منگا کر اصرار سے پلاتے...... درزی ہر کپڑا درست سی کر لانے لگتا...... یکدم آپ افسر کی مونچھ کا بال بن جاتے...... موٹر سائیکل پہلی کک میں چلنے لگتا...... چھوٹی بڑی ہر قسم کی گڈلک کا ڈھیر لگ جاتا۔

ان سے خواہشات کے اظہار کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جہاں ہوتے وہاں کی ضرورت محسوس کر لیتے اور پھر ایک ایسی جگہ جا کر التجا کرتے جہاں سے وہ کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹے تھے...... برسوں کی بیماری نکل جاتی...... مقدمہ حق میں ہو جاتا' جانی دشمن ایک روز مٹھائی کا ٹوکرا اٹھائے معافی مانگنے آ جاتا' ہمسائے ہنس ہنس کر سلام کرنے لگتے' بیوی کا عاشق کسی اور کے ساتھ بھاگ جاتا، بچے خود کتابیں لے کر پڑھنے لگتے' بلاوجہ برسوں سے گھبرایا ہوا دل ہر جگہ خوش رہنے لگتا' خیر ہی خیر ہو جاتی...... آنند ملتا...... سر سے لوہے کی ٹوپی' پیروں سے تنگ جوتی' کمر پر کسی ہوئی بلٹ' گردن میں جکڑی ہوئی ٹائی' کلائی کو کھینچنے والی گھڑی کی سٹین لیس سٹیل کی چین' تنگ انگوٹھی' خون نکالنے والے آویزے...... چبھنے والی زپ سب سے پتہ نہیں کیسے چھٹکارا مل جاتا۔

جب شہاب بھائی کی Wishing سے عکسی کو نوکری ملی تو عکسی نے لاہور میں اول اول فوک لور سنٹر بنایا۔ اس کی بلڈنگ ہمارے گھر سے کچھ دور نہ تھی۔ وہ اپنے دفتر کو کیمپس' چپڑاسی رزاق کو آفیسر اور نوکری کو تحفہ سمجھتا تھا۔ ان دنوں میں شہاب صاحب کی اس جہت کو نہ جانتی تھی۔ کیمپس اور آفیسر تک میں نے مان لیا لیکن مجھے یہ یقین نہیں آتا تھا کہ عکسی کو اس کا جوب چاندی کی تھالی پر آپی آپ بغیر کسی کوشش کے ملا ہو۔

ایک شام لیچی کے درخت کے پاس عکسی اور میں بیٹھے تھے عکسی کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ محبت بھری گفتگو کرتا کرتا اچانک پہاڑ کے پیچھے جا چھپتا ہے اور کورا اجنبی بن جاتا ہے۔ مفتی جی ایک موڈ کے آدمی ہیں۔ عکسی کے ہر موڈ میں کئی اور موڈ چھپے ہوتے ہیں۔ وہ ہنستے ہوئے روتا ہے بات کرتے کرتے کہیں اور پہنچ جاتا ہے اور موجود رہ کر محسوس نہیں ہوتا۔ تینوں بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح عکسی شہاب صاحب کے متعلق کچھ بتانا کچھ چھپانا چاہتا تھا۔

"قدسی تمہیں معلوم نہیں ہے" Shahab is a power ۔

"کیا مطلب......؟"

"اس کی ایک magnetic field ہے...... اس فیلڈ میں جو بھی داخل ہوتا ہے اس پر کچھ وارداتیں ہونے لگتیں ہیں"۔

"مثلاً............"

"مثلاً یہ کہ میں اس جوب کو deserve نہیں کرتا لیکن چونکہ میں شہاب کے مقناطیسی دائرے میں ہوں کوئی مجھ سے یہ نوکری لے نہیں سکتا......"۔

"اب تم اس قدر خوش بھی نہ ہو جاؤ عکسی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، کچی نوکری اور وہ بھی نیم سرکاری...... کل بلاسٹ کر دیں تو تمہارا پتہ نہ چلے...... ایویں"۔

"جب تک شہاب نہ چاہے مجھے کوئی بلاسٹ نہیں کر سکتا...... جمیل الدین عالی کو دیکھو...... انشاء جی کو دیکھو...... اپنے خان صاحب کو دیکھو...... ذرا دیکھو...... Watch کرو......

Shahab has wished them well, thats all.

جس روز شہاب بھائی کا انتقال ہوا اس روز دوپہر کے وقت مجھے عکسی کی خوبصورت بیوی تہمینہ نے بتایا کہ "عکسی کے جوب کا برا حال ہے اس کی جگہ کوئی اور پوسٹ ہو گیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب عکسی کو یا تو استعفیٰ دینا پڑے گا یا چھٹی کرنی ہو گا"۔ یکدم میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بابا شہاب اپنی برکتوں کے پاؤں بھی سمیٹ کر ساتھ لے گئے ہیں۔ میں نے عکسی سے پوچھا تو کہنے لگا...... "ہاں ٹیمی ٹھیک کہتی ہے حالات مخدوش ہیں"۔

"پھر کوئی سفارش لڑائی؟"

"نہیں"۔

"کوئی سفارش کرو گے؟"

"نہیں......"

"احمق الذی...... انس نای کا سوچو بھلاوہ کیا کریں گے کوئی منسٹر وغیرہ پکڑو تم تو اسلام آباد میں رہتے ہو......"۔

"ہرگز نہیں......"

"ہیں کیا کہہ رہے ہو؟"

عکسی نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور بولا...... "مجھے یہ نوکری اللہ کی مہربانی سے سلور کی ٹرے میں ملی تھی...... میں نے اس کے لئے کوئی کوشش، کوئی سفارش نہیں لڑائی جب تک وہ چاہتے ہیں رکھیں گے جب نہیں چاہیں گے میں چلا جاؤں گا...... لیکن کوشش نہیں کروں گا......"۔

"مارے جاؤ گے......"

"ہاں ہو سکتا ہے......"

"تمہارے بچے چھوٹے اور نازک مزاج ہیں"۔

"وہ تو ہے......"

"پھر............"

"زیادہ مت سوچو قدسی اللہ مالک ہے...... اب تو شہاب صاحب اور آگے چلے گئے ہیں اب کام کیسے خراب ہو سکتے ہیں"۔

عکسی چھٹا پٹی کے فیصلوں کا عادی ہے۔ سفارش نہ کرنے کا بھگتان بھی اس نے اسی وقت کھڑے پاؤں کیا تھا۔

اسی طرح سن ۷۲ء میں عکسی مفتی نے اپنی پہلی شادی کا نبٹاؤ کرتے ہوئے مجھے انگریزی میں خط لکھا تھا۔

۱۲۔ ۱۔ ۷۲

۲۰۲ آدم جی روڈ

راولپنڈی

ڈیئر بانو!

کل میں نے وژن برٹن کی بنائی ہوئی بیس پچیس منٹ کے دورانیے کی فلم "فال آف ڈھاکہ" دیکھی۔ یہ لہو منجمد کرنے کا ایک تجربہ ہے۔ ریزہ ریزہ کرنے والا سچ اور پھر بھی کہتے ہیں کہ ہم اس سچ کی تاب لائیں!

میری روح پر ایک خوفناک اندھیرا چھا گیا ہے جو چھٹنے کا نام نہیں لیتا۔ میں اپنا دل بہلانے کے جتن کرتا ہوں لیکن یہ سکون بے حد وقتی ہوتا ہے۔ ایسے لمحوں میں نہ جانے کتنی بار مجھے تمہارا وہ خط یاد آتا ہے جو نہ جانے تم نے کس دیوانگی میں لکھا تھا۔

"یہ مکمل تنہائی ہے...... جانے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ شادی اس تنہائی کا حل نہیں ہے"۔

میں نے اس خط کو احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے اور کئی بار اسے یاد کرتا ہوں لیکن اس نصیحت کے باوجود میں نے گھر بسانے کا فیصلہ کر لیا ہے میں جانتا ہوں کہ شادی بھی میری مدد نہ کر سکے گی۔ چلو کچھ تو تبدیلی آئے گی اور اس تعفن سے کچھ تو چھٹکارا ہو گا۔

انسان ہمیشہ تبدیلی کی خواہش رکھتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ایسا اچھا نہیں جو ہمیشہ رہ سکے۔ تعلیم 'ملازمت 'بیوی 'بچہ 'گھر...... ہم ان منزلوں کے سہارے زندہ رہتے ہوئے بھی تبدیلی کے خواہاں رہتے ہیں اور بڑھاپے کو جا پکڑتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر آخری ایک ہی منزل رہ جاتی ہے...... موت! ساری منزلوں کی واحد منزل...... بلاشبہ یونگ جیسے بڑے نفسیات داں نے اسی لئے کہا تھا...... "جس طرح ایک سکہ خرچ ہو کر ہی اپنے پورے مول پاتا ہے اسی طرح موت انسانی روح کی صحیح قیمت آنکتی ہے"۔ اس طرح یونگ نے ساری انسانی زندگی کی ایک ہی منزل طے کر دی تھی...... موت! میں نے تہمینہ سے درخواست کر دی ہے.......... وغیرہ وغیرہ

اس خط کو پڑھ کر میرا لہو خشک ہو گیا۔ میں شگون پر اعتقاد رکھتی ہوں۔ گھر سے نکلتے وقت کالی بلی راستہ کاٹے تو باہر جانے کے لئے میرے پاؤں نہیں اٹھتے۔ شادی اور موت کا ذکر ایک ہی صفحے پر دیکھ کر میرے طوطے اڑ گئے اور بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔

اس خط کے بعد پورے سترہ سال بعد جون میں ہمیں عکسی نے اپنی دوسری شادی کے بعد خط لکھا

۸۸-۶-۱۱

عزیز ترین بانو اور اشفاق......

اس ماہ رمضان میں میری دوسری شادی ہو گئی۔ میں نے ابو کو نہیں بتایا لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا ان کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ہو گی۔ وہ دوسری شادی کو شدید نفرت سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ خود اس کا شکار رہے ہیں...... ساری زندگی!

بہت بہت سال گذرے جب میں بیمار اور تنہا تھا مجھے تمہارا ایک خط ملا تھا ابھی بھی میرے پاس یہ خط ہے...... میں اس کی کاپی بھیج رہا ہوں۔ پڑھ لو۔ مجھے یقین ہے تمہیں یہ خط یاد نہ ہو گا 'تمہیں یہ بھی یاد نہ ہو گا تم نے یہ خط کیوں لکھا۔ جس طرح تمہیں یاد نہیں کہ یہ خط کیوں لکھا گیا۔ ایسے ہی میں نہیں جانتا کہ میں نے دوسری شادی کیوں کی...... مقدر کی عجیب طاقت نے مجھے مجبور کر دیا...... اس طاقت کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ ہی اسے کنٹرول کر سکتا ہوں.......... ..

دغیرہ وغیرہ

اگر آپ کو میاں بیوی دونوں سے محبت ہو جیسی مجھے اور خان صاحب کو تہمینہ اور عکسی

سے ہے تو بڑی مصیبت پڑ جاتی ہے دونوں کی طرفداری کرتے کرتے دونوں کا پوائنٹ آف ویو سمجھنے کی کوشش میں دونوں کو سینے سے لگانے کا عزم کرتے کرتے آپ کسی کو بھی قریب نہیں لا سکتے اور عجیب الو کا پٹھا محسوس کرتے ہیں۔

دوسری شادی تو عکسی نے بہت بعد میں کی اور مجھے یقین ہے کسی ماورائی طاقت تلے کی۔ لیکن جب سے شہاب بھائی کا وصال ہوا ہے تب ہی سے دل میں میرے عکسی کے لئے بڑا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس بار جو خلاء اس کے دل میں پیدا ہوا وہ فال آف ڈھاکہ سے کہیں بڑا تھا۔ شہاب بھائی کی موت نے ایک ہی بو کے ساتھ عکسی کے کنوئیں کا سارا میٹھا پانی نکال لیا۔ اب اس کے اندر جھانکنے پر کنوئیں کے خالی پن سے خوف آتا تھا۔ اس بار بھی عکسی نے تنہائیوں کا وہی علاج سوچا جو مرد عام طور پر سوچا کرتا ہے۔ گرہست کی اوکھلی میں سر دے کر اتنے دھمکے دھوکے کھانا کہ پھر نہ اپنی ہوش رہے نہ کسی اور کی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اس بیوہ یتیم پر ترس کھانے والا کوئی نہیں۔ اسے پیار سے 'باتوں میں لگا کر 'کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹارچ دکھانے والا ہاتھ اپنی منزل سیدھی کر گیا۔ اب عکسی سے نہ کسی کی آس لگی ہے نہ ہی عکسی اپنے گھور اندھیرے میں کسی روشنی کی امید رکھتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جاتے جاتے شہاب بھائی اسے سلور کی تھالی پر فقیری کی جنم گھٹی پیش کر گئے ہیں اب وہ بڑا افسر تو ہے...... لیکن فوک ہیرٹیج کے کنوئیں کی خالی تنہائی میں شیشے والی لمبی میز پر سر رکھ کر وہ بھی اشفاق احمد کی طرح سوچتا ہو گا۔

اوکھا گھاٹ فقیری دا بھئی اوکھا گھاٹ فقیری دا
مسلاں دے وچ ویلا کڈھنا 'میٹنگ، دے وچ بہنا
اوکھیاں دے نال متھالا کے یس سر یس سر کہنا
ہسدے ہسدے رہنا
اپنی سیٹ تے عاجز بن کے اگے ہو کے بہنا
مرشد موہرے گل نہ کرنی جو آکھے سو سہنا
دنیاداری کم نہیں ایہہ کم اے پتہ چیری دا
اوکھا گھاٹ فقیری دا

عکسی جیسا اعتقاد اور مفتی جی جیسا جذبہ آج تک ہمیں نصیب نہ ہو سکا۔ لیکن اس میں ہمارا بھی کیا دوش؟

سنا ہے جیسا اعتقاد ہوتا ہے ویسی ہی واردات ہونے لگتی ہے۔ کئی برس ہم شہاب بھائی کے ساتھ ساتھ رہے لیکن مومی بگلا پانی میں تیرتا رہا اور بھیگا نہیں۔ ہم ان پر وہ بھروسہ نہ کر سکے جو مفتی جی کے گھرانے کی اساس ہے۔ میں مفتی جی کی باتوں کو سنتی 'پل بھر کو مانتی پھر بھول جاتی لیکن عکسی کی باتیں چونکہ

ساری کی ساری انگریزی میں ہوتی تھیں ان کا اثر بھی مجھ جیسی تھرڈ ورلڈ کی عورت پر دونا ہوتا لیکن یہ اثر بھی...... وقت کے ساتھ زائل ہو جاتا۔ شہاب صاحب کو پیربابا' اللہ لوک' سائیں بادشاہ سمجھنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ہم تعلیم یافتہ' نئی روشنی اور مغربی سوچ کے لوگ تھے۔ ہمارے لئے سن ۷۰ء تک شہاب بھائی کی ایسی کوئی جہت نہ کھلی کیونکہ خود ہمارے وجود کو اس سوچ کی ضرورت نہ تھی۔ ہم اپنے کس بل میں اتنے مشغول تھے کہ کسی اور کی قوتیں ہمیں اگر متاثر بھی کرتیں تو یہ بالکل کتابی بات ہوتی۔ مفتی جی ہمیں دیکھ دیکھ کر جلتے' بے حال ہوتے۔ وہ ہمیں باتوں کے دیئے جلا کر روشنو روشنی کرنا چاہتے تھے۔ نہ خدا ہماری ضرورت تھا' نہ اس کے بندے ہماری لائن تھے ان دنوں مفتی جی کی خط و کتابت کا یہ رنگ تھا۔

بانو!

تم دونوں پر اب کوئی امید نہیں رہی۔ تمہارے ذہن بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں۔ تمہارے دل گلے ہوئے ہیں۔ تمہارے اندر دیمک لگی ہوئی ہے۔ تمہارے ایمان اس لئے مضبوط نہیں کہ تمہاری "انا" بہت خود سر ہے۔ تم بیل نہیں بن سکتے جو دوسرے کا سہارا لے۔ تم میں امید کا دیا نہیں جلتا۔ اس لئے کہ تم اپنی انا کے اندھیرے میں رہنا پسند کرتے ہو۔ تم کسی دوسرے کو دیپ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ بہت چھوٹی انا' بیل ہوں' سہارے لیتا ہوں۔ اتنا غلیظ ہوں کہ پاک صاف کی پاکیزگی مجھے دکھتی ہے' بری لگتی ہے تم دونوں اور میرا کوئی میل نہیں پھر بھی مجھے اس پر فخر ہے کہ میں تم دونوں کے قریب سمجھا جاتا ہوں تمہیں جانتا ہوں.......... تمہارا دوست سمجھا جاتا ہوں۔

ممتاز

مفتی جی کا یہ سچا خط ملا۔ ہم پر اثر نہ ہوا کیونکہ ہمارے غبارے میں انا کی گیس ہمیں اوپر ہی اوپر اڑائے لئے جاتی تھی' اتنا اوپر کہ کبھی کبھی خوشی سے دل دھڑکنا بند ہو جاتا۔ مفتی جی نے شہاب بھائی کے سلسلے میں جو آخری خط لکھا وہ یہ تھا۔

بانو!

کتے کا کام ہے بھونکنا۔ کوئی سنے نہ سنے۔ پروا کرے نہ کرے۔ لاہور میں میری دو چیزیں ہیں۔ جو بے حد قیمتی ہیں ایک تم...... دوسرے اشفاق' تمہارے بچے اور وہ سب جو تم دونوں کو عزیز ہے۔

میں دیر سے بھونک رہا ہوں۔ تم عقل کی ترازو میں تولتے ہو تو میری بھونک کو تولتے رہو.....میں بھونکنا بند نہ کروں گا۔

اللہ تم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

ممتاز

نہ تو میں مارے ندامت کے اس خط کا جواب دے سکی نہ ہی مفتی جی سے جھوٹ بولنے کی ہمت پڑی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی طرح اعتقاد کرنے کے لئے ان جیسا خمیر بھی ضروری تھا۔ اللہ تو گھڑی گھڑائی صورتیں بھیجتا ہے۔ مچھلی اڑنے کے خواب تو دیکھ سکتی ہے پر اڑے کیسے؟

بہت سال پیچھے کی بات ہے مفتی جی ابھی سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتے تھے اور انہیں ہومیو پیتھی کا چسکا نہ لگا تھا۔ ہم ان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے تینوں بچوں کو موٹر سائیکل پر اسلام آباد کی سیر کرانے کے بعد وہ ان گنت بسکٹوں کے ڈبے اٹھائے آنگن میں آئے۔ وہ ہماری محبت سے دمک رہے تھے۔

خان صاحب نے ایک بسکٹ لفافے سے نکال کر کہا "یار مفتی میں بھول نہ جاؤں...... شہاب کو ضرور ملنا ہے' بڑا اچھا دوست ہے"۔

مفتی جی سدھائے ہوئے بھالو سے خونخوار بھیڑیئے بن گئے۔

"اوئے تو شہاب کو اپنا دوست سمجھتا ہے؟ شہاب کسی کا دوست نہیں۔ خان صاحب اس بھرے میں نہ رہنا ہاں جی۔ جہاں شہاب ہے وہاں دوستیاں نہیں ہوتیں۔ یہ صوفی لوگ کب دوستیوں کی پروا کرتے ہیں۔ یہ ایک اور مخلوق ہے یہ خود غرض لوگ تو مسلک پر بیٹا قربان کر دیتے ہیں"۔ میری نگاہوں میں ثاقب گھوم گیا۔

"کون سا بیٹا مفتی جی" خوفزدہ ہو کر میں نے سوال کیا۔

"حضرت ابراہیم نے بیٹا قربان نہیں کیا تھا؟...... یہ شہاب اسی قبیل کا ہے...... یہ کب پروا کرتا ہے بیٹے بیٹیوں کی...... دوست کون ہوتا ہے اس کی ڈکشنری میں یہ لفظ نہیں ہے ہاں"۔ میرے لئے قدرت اللہ شہاب کا یہ بالکل نیا اور انوکھا تعارف تھا۔ میں شہاب بھائی کو ایک ایسا رحم دل انسان سمجھتی تھی جو بیٹے قربان کرنے کے قابل نہ تھا لیکن مفتی جی کی بات چونکانے والی تھی' میرے اعتقادات کو ٹھیس پہنچی۔ کچھ دیر سب خاموشی سے بسکٹ کھاتے رہے پھر خان صاحب نے بڑے جھینپو انداز میں خوش کرنے والی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے اور شہاب کے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا' اب تو مفتی جی کے حساب پانی سر سے گزر گیا وہ بولے...... "اوئے تم دونوں اندھے ہو...... پیدائشی اندھے...... قدسیہ کو اشفاق

اشفاق احمد

کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اور اشفاق کو اپنے سوائے کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ اوئے اندھو! پانی میں رہتے ہو پر تمہارے بطخ جیسے مومی پر کبھی نہیں بھیگتے۔ تم دونوں اشفاق...... یار شہاب میں رہتے ہو اور بالکل خشک جیسے بریتی...... " اشفاق خان کا داؤد خانی گیہوں جیسا رنگ گلابی ہو گیا۔

مفتی جی شدید ہیں اور اظہار کو لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ صرف وہاں دوستی پال سکتے ہیں جہاں ہم نظری قائم رہے...... خان صاحب مصر تھے کہ شہاب بھائی ان کے دوست ہیں۔ مفتی جی کے لئے یہ بات سمجھنی، ماننی، قبول کرنی ناممکن تھی اس لئے بڑا دنگا ہوا۔ جب بھڑاس نکل گئی تو مفتی جی اور خان صاحب مل کر شہاب بھائی کو ملنے چلے گئے اور میرا پتہ کاٹ دیا۔

مفتی جی نے اسلام آباد منتقل ہونے کے بعد شہاب صاحب کے متعلق ڈائریاں رکھیں، ان کے خط محفوظ کئے، اخباروں میں سے تراشے کاٹے۔ وہ شہاب بھائی کے متعلق اتنا ڈیٹا جمع کر چکے تھے کہ کبھی کبھی لگتا وہ دن دور نہیں جب وہ شکر پڑیوں کے درختوں پر شہاب شہاب لکھا کریں گے اور اگر کسی نے انہیں روکا تو وہ روکنے والے کا سر قلم کر دیں گے...... لیکن اتنا سارا اظہار بھی حجاب بن گیا اور مجھے اصلی شہاب بھائی نظر نہ آ سکے۔

اظہار کا طریقہ جب فیل ہو گیا اور میں ان سے تبادلہ خیال کے باوجود کچھ بھی نہ سمجھ سکی تو میری کھوج نے ایک اور راستہ محسوس کیا۔ یہ طریقہ خاں صاحب کا ہے۔ خاں صاحب دیہات سے آئے ہیں۔ گاؤں میں لوگ آسمان کو دیکھ کر بارش کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ہواؤں کا رخ ہی انہیں موسموں کا پتہ دیتا ہے۔ ٹٹیری بولے تو بارش مانگتی ہے۔ کوا کائیں کائیں کرے تو پروہنا آتا ہے۔ کسان کے لئے فطرت کے راز کھیتوں، درختوں، کھلیانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ خاں صاحب کو ہر کسان کی طرح ہمیشہ سے بزرگوں کی بُدھی پر بڑا اعتماد ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرن ہا قرن سے جو عقلمندی اور سوجھ فضا میں اکٹھی ہوتی رہی ہے اگر آج کا انسان اسی سوچ کا فائدہ اٹھائے تو کئی رائیگاں سفر ختم ہو جائیں۔

خاں صاحب کا خیال ہے کہ سائنس چونکہ اپنے پرکھوں کی عقل، نصیحت، انکے خوابوں، تجربوں پر چل کر آگے بڑھتی ہے اسی لئے سائنس کا سفر سیدھی لائن میں ہے اور انسان چونکہ پچھلی عقل سلیم کے سٹور سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس لئے بنی نوع انسان کے رویوں کی گروتھ دائرے میں ہوتی ہے۔ ہر پود اپنے تجربے خود کرتی ہے۔ پچھلے بابوں کے نچوڑ سے فائدہ نہیں اٹھاتی اس لئے اسکا سفر ہمیشہ دائرے میں رہتا ہے۔ کبھی یہ دائرہ آتش بازی کے دائرے کی طرح اوپر چڑھتا ہے کبھی سیڑھیوں کے سپائرل کی طرح اٹھتا ہے لیکن بنی نوع انسان کی ذات کا ارتقا سیدھی لائن میں نہیں ہو پاتا اسی لئے ہر پیڑھی عموماً ریس کے سٹارٹنگ پوائنٹ سے ہی سفر شروع کرتی ہے۔ ساٹھ ستر سال کا سفر ختم کر کے جب منزل پر پہنچتی ہے تو دوسری پود منزل سے سٹارٹ نہیں لیتی بلکہ پھر سٹارٹنگ پوائنٹ پر پہنچ جاتی ہے اسی طرح انسان کبھی ارتقائی

طرف نہیں چل سکتا۔ڈائروں میں گھومتا رہتا ہے۔

خاں صاحب سونگھ کر 'محسوس کر کے' دیکھے بغیر جو اندازہ لگاتے ہیں۔ اسکا اظہار کبھی نہیں کرتے۔ انہوں نے شہاب بھائی کو کبھی ابوالفضل 'ابوالکلام' ابوالحسن نہ پکارا' وہ انہیں قطب' ولی' ابدال ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ وہ تو ہمیشہ بے تکلفی سے شہاب بھائی کو اپنا سب سے پیارا دوست ہی سمجھتے رہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی سبز ڈائری ایسی بھی ہمارے گھر میں موجود ہے جس پر شہاب بھائی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی آیتیں' وظیفے' ورد رقم ہیں۔ کیا خان صاحب ان وظیفوں پر عمل کرتے ہیں؟ کیا شہاب بھائی ان کی تعلیم فرماتے رہے ہیں؟ کیا خان صاحب جو بڑے گرہستی' منتظم اور کثیرالمقاصد شخص ہیں' ایسی اندرونی زندگی کو باقاعدگی سے اپنا سکتے ہیں؟ اس چیستان کی طرف کوئی اشارہ مکمل طور پر نہیں ملتا کیونکہ کسان فطرت کی باتیں سمجھتا ضرور ہے ان کا برملا ذکر کسی سے نہیں کرتا۔

ابھی ہم سمن آباد میں تھے جب مجھے خان صاحب کے طریق پر عمل کر کے احساس ہو گیا کہ بظاہر وہ بہت معمولی روش اختیار کر کے' معمول زندگی کو عام سطح پر رکھ کر' ہنسی مذاق کا پردہ ڈال کر چلنے والے ہیں شہاب بھائی ہر گز ہر گز عام روش کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کے عمل کا طریقہ گو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن وہ تہہ در تہہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کی سمجھ بالکل ویسے ہی آئی جیسے ہواؤں میں منہ اٹھا کر کسان کہتا ہے...... "آج سہ پہر کے وقت بارش آئے گی...... کوے گدھ اونچے اونچے اڑ رہے ہیں"۔

سمن آباد میں ہمارا گھر ٹیوب ویل والی گراؤنڈ کے سامنے نکڑ پر تھا۔ اس گھر کی دو منزلہ عمارت اور کاٹھی بڑی مضبوط تھی۔ چھوٹے سے بیرونی برآمدے میں ایک پرنٹنگ مشین پڑی رہتی تھی۔ جس پر ہم کبھی چادر' کبھی ترپال اور کبھی گتے کی شیٹ ڈال کر اس کی حفاظت کا انتظام کیا کرتے تھے۔ پھاٹک کے ساتھ ساتھ وہ تین فٹ اونچی دیوار تھی جس پر میرے بیٹے انیق خان اور انیس خان دونوں بازو پھیلا کر چلنے کی پریکٹس کیا کرتے تھے جیسے سرکس میں لیڈی تار پر چھتری لے کر چلتی ہے اور اثیر خان سیڑھی پر بیٹھ کر ان کا واحد تماشائی ہوا کرتا تھا۔ اگر اشفاق خان گھر پر نہ ہوتے تو شہاب بھائی اس برآمدے سے آگے نہ بڑھتے۔ یہیں پرنٹنگ مشین کے پاس کھڑے ہو کر کچھ ندامت' کچھ لجاجت اور کچھ اوپرے پن سے میری خیریت پوچھتے...... بچوں کا سرکس دیکھتے۔ اثیر خان کی گال چھو کر' شرمائے سے' اس کا حال پوچھتے اور چلے جاتے...... خان صاحب کے سوائے اس گھر میں ان کا کوئی واقف نہ تھا۔

اسی واقفیت کو بڑھانے کے لئے ایک روز مجھے خان صاحب نے کہا "بھئی کل شام شہاب اور عفت کھانے پر آ رہے ہیں تم کوئی انتظام وغیرہ کر لینا"۔

مجھے مہمانوں کی خوشی بہت چڑھ جاتی ہے۔ میں اس معاملے میں ریگستان میں رہنے والے بدو

لوگوں کی طرح ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے تمام پیتل کے برتن مانجھے جائیں' دریاں کھیس جھاڑ کر بچھائے جائیں' ہار پان ہوں' ڈھول تاشے بجیں۔ کہیں سے ایک سرخ قالین کا ٹکڑا بھی آئے جو مہمان کے لئے بچھایا جائے۔ کوئی مینڈھا ذبح ہو۔ کوئی دیگ چڑھے۔ یہ ساری شو آف قسم کی میزبانی شاید میں نے سکول سے سیکھی تھی جہاں انسپکٹر آف سکولز کی آمد پر چھڑکاؤ ہوتے' کیلے کے پتوں کے پھاٹک بنتے' سفیدیاں ہوتیں۔ بچے انسپکٹر آف سکولز کے راستے میں پھول کی پتیاں بچھاتے اور زور زور سے بینڈ بجتا۔ "فور ہی از اے جولی گڈ فیلو...... فور ہی از اے جولی گڈ فیلو......"۔

میرے چہرے پر مہمان کی خبر لگتے ہی جو خوشی پھیلی ہو گی اسے دیکھ کر خان سٹپٹا گئے۔ "دیکھو قدسیہ کچھ بڑھا چڑھا کے نہ کرنا...... شہاب ایسی باتوں سے گھبرا جاتا ہے ہم باورچی خانے میں کھانا کھائیں گے۔ تم پوریاں کچھ اچھی بنا لیتی ہو بس وہی ٹھیک ہیں۔ آلو کی پوریاں چنے وغیرہ...... زیادہ کچھ نہ کرنا......"۔

اس گھر کے شروع میں برآمدہ اور آخر میں باورچی خانہ تھا۔ اور اصل میں یہی دو جگہیں زیادہ آباد رہتی تھیں۔

"لیکن باورچی خانے میں کیوں خان صاحب...... ؟ ہمارے پاس تو ٹوٹل چار ڈگڈگی موڑھے ہیں۔ ایک چھوٹی تپائی ہے تیل کا چولہا ہے...... یہاں وہ کیسے کھانا کھائیں گے؟"۔

"جیسے کھاتے ہیں ویسے کھا لیں گے......"۔

خان صاحب میں ایک بڑی زیادتی ہے۔ وہ کسی کی خاطر نہ اپنی زندگی کا پیٹرن نہ اپنے معمولات' نہ ہی اپنے مزاج کا زاویہ بدلتے ہیں۔ وہ جس طرح بیٹھے ہوں گے ویسے ہی مہمان سے ملنے چلے جائیں گے' بلکہ اسے اپنے پاس بلا لیں گے۔ جو کھا رہے ہوں گے اسی چٹنی روٹی میں مہمان کو شامل کر لیں گے۔ جیسا موڈ ہو گا اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ان کے پاس کھانے اور دکھانے کے لئے ایک ہی سیٹ دانتوں کا ہے۔ دفتر' غسل خانے' بازار' ریڈیو سٹیشن' ٹیلی ویژن' سٹوڈیو میں اشفاق احمد گرگٹ کی طرح رنگ نہیں بدلتے بلکہ ہر مقام اور جگہ پر ان کا صرف رول بدلتا ہے وہ خود وہی رہتے ہیں' اگر وہ کسی ادبی محفل میں پاکستان یا اسلام کی خیر خواہی میں کسی سے الجھ جائیں تو میں لاکھ ہاتھ باندھوں وہ اپنا نظریہ بیان کر کے رہیں گے۔ اگر وہ کتابوں والی الماری کی جانب چہرہ کر کے کتاب پڑھنے میں مصروف ہیں اور کوئی مہمان آ جاتا ہے تو وہ بھاگم بھاگ نہ اپنی نیکر جیکٹ بدلیں گے نہ ہی اپنا انداز نشست۔ بس اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے کبھی گفتگو کے ساتھ' کبھی مکمل خاموشی سمیت مہمان کے پالا گن رہیں گے...... دراصل اس انداز سے خان صاحب کی مراد یہی ہوتی ہے کہ مہمان مکمل طور پر اپنے آپ کو گھر کا فرد سمجھے۔ بیٹھنا چاہے تو بیٹھے' باورچی خانے میں کچھ کھانا پینا چاہے تو زہے نصیب...... وی سی آر یا ٹیلی ویژن لگا کر چھوٹے خانوں سے

گپ شپ کی خواہش ہو تو اور بھی اچھا۔ کوٹھے پر چڑھ کر کبوتروں کو دانہ دنکا ڈال کر راضی ہوتا ہو تو کسی قسم کی ممانعت نہیں۔ باہر زاویئے میں بیٹھ کر کسی سے لمبے لمبے فون کر کے خوش رہے تو کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔ ایسی فضا میں آزاد منش لوگ ان سے بہت زیادہ ہل جاتے ہیں لیکن فارمل لوگ جنہیں ڈرائنگ روم، نمائش کی گفتگو، سجی سجائی ٹرولیاں، ٹشو پیپر، کوارٹر پلیٹیں، گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھنے کی عادت ہو، ان سے زیادہ دیر راضی نہیں رہتے۔

شہاب بھائی کو غالباً خان صاحب کی یہی ادا پسند تھی۔ خود آزاد رہنا اور دوسرے کو آزاد رکھنا۔ اسی لئے وہ خان صاحب سے زیادہ خوش نظر آتے تھے۔

سمن آباد کے چھوٹے سے آٹھ بائی چھ کے باورچی خانے میں اس شام ایک بڑی یادگار دعوت ہوئی۔ چھوٹی سی نیچی تپائی نما میز پر ویشنو کھانا چنا گیا۔ جس وقت شہاب بھائی اور عفت آئے وہ نیچے گول موڑھوں پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گئے حالانکہ اس وقت عفت نے سفید ساڑھی اور ہنڈولے کی شکل کے آویزے پہن رکھے تھے اور شہاب بھائی پر تکلف نیلے سوٹ میں ملبوس تھے۔ وہ یا تو کسی فارمل پارٹی سے آ رہے تھے یا ان کو اس دعوت کے بعد گورنر ہاؤس وغیرہ جانا تھا۔ شہاب بھائی نے بغیر تعریف کئے کھانا اس رغبت اور محبت سے کھایا کہ ہمیں احساس بھی نہ رہا کہ اس سے زیادہ کچھ کرنا ممکن بھی تھا۔

اسی یادگار دعوت شیراز کے دوران شہاب بھائی نے ان ادیبوں کی فہرست تیار کی جن کو گلڈ کی طرف سے مشرقی پاکستان جانا تھا۔ جتنی دیر یہ لسٹ تیار ہوتی رہی اعجاز بٹالوی اور جمیلہ ہاشمی کا نام بار بار آیا۔ میں اس وقت صاحب کتاب تھی لیکن ان دونوں کے چہروں پر میری ادیبی کی کوئی پہچان نہ تھی...... بار بار میرا جی چاہا کہ کہوں شہاب بھائی آپ مجھے مشرقی پاکستان بے شک نہ بھیجیں لیکن پلیز اتنا تو مانیں کہ میں ادیبوں کی فہرست میں شامل ہونے کے قابل ہوں۔

ایسی ہی خفت میں نے ایک دفعہ پہلے بھی برداشت کی تھی۔ میرا منجھلا بیٹا انیس خان بیمار تھا اور میں اسے گودی میں اٹھا کر سمن آباد کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ انیس ابھی تھوڑا تھوڑا اصاف بولنے لگا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی فیس کتنی ہو گی۔ میرے پاس جو چند روپے کے نوٹ تھے انہیں میں نے بل دے کر مٹھی میں قابو کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑی بند بند شخصیت کے آدمی تھے۔ ان کے کلینک میں کوئی مریض نہ تھا۔ پھر بھی وہ فارن کوالیفائیڈ ڈاکٹروں کی طرح ذہنی طور پر Pre-occupied نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں کرسی میں آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ انیس خان کی بند ناک سے سیٹی کی آواز بار بار آتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نہ مریض کی حالت پوچھنے کے موڈ میں تھے نہ ہی بولتے تھے۔ میں نے انہیں ملائم کرنے کے انداز میں کہا۔

"جی میں اشفاق احمد کی بیوی ہوں...... "۔

ان کے چہرے پر اس نام سے کوئی چمک نہ آئی۔ بلکہ ایک ابرو قدرے اور اوپر اٹھ گیا۔

"ممتاز مفتی اور شہاب صاحب کا نام تو آپ نے سنا ہو گا...... قدرت اللہ شہاب! وہ میرے شوہر کے بڑے دوست ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے مربیانہ انداز میں مسکرانے کی ہلکی سی کوشش کی لیکن ان دونوں ناموں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ "میں بھی لکھتی ہوں...... ریڈیو ڈرامے...... کہانیاں ناول...... "۔

ان کے چہرے پر "اوں ہوں" ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے درمیان میں جملہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔

"منہ کھولو...... اور...... اور...... " میری باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے انہوں نے انیس خان سے کہا۔ ماں کی باتوں کے جھوٹ کی تصدیق وہ بیٹے کا دہن کھلوا کر کرنا چاہتے تھے۔

انیس نے منہ کھولا......

"اور...... "

چھوٹا سا دہن اور کھلا

"اور...... "

انیس کا رنگ بدلا اور منہ اتنا ہی کھلا رہا۔

"کیا نام ہے تمہارا...... "۔

انیس نے توتلی زبان میں مٹھار مٹھار کر ایک لمبی سی غلیظ گالی دی۔

ڈاکٹر صاحب جو Snob تھے پورے جھنجھوڑے گئے۔

"کیا...... ؟"

"لالہ...... " اور اس کے آگے پھر چند توتلی...... ماں بہن کی شان میں مغلظات۔

"بیٹے میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں"۔

انیس نے یہ گالیاں اپنے ماموں پرویز، تایا افتخار اور ملازم زمان سے سیکھی تھیں۔ اس نے نیا نیا بولنا سیکھا تھا اور سکھانے والے سمجھتے تھے کہ بچے کی زبان سے اول اول یہی کچھ نکلتا اچھا لگتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر ململ کا کرتہ، موتئے کا ہار، تھوڑا سا پان بھی بچہ کھا لے تو سبحان اللہ۔ میں نے ہاتھ میں رول کئے ہوئے روپے میز پر رکھے، دنگ ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھنا بھول گئے۔ شاید انہیں یقین آ گیا تھا کہ میں ادیبہ ہوں اور اس انوکھی نوع کے لوگوں کے ہاں ایسے ہی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بالکل ایسی خفت میں نے تب محسوس کی جب گلڈ کی جانب سے ادیبوں کا وفد مشرقی پاکستان چلا گیا اور میری ادیبی نے کوئی گل نہ کھلائے۔ کئی دن میں اندر ہی اندر اس بے انصافی پر کڑھتی رہی۔ سندر بن کے ہاتھی، جوہڑوں میں اگے شپلا کے

پھول ' بازاروں میں بکتے ناریل ' لمبی زلفوں سیاہ آنکھوں والی بنگالنیں..... یہ بند خواب میں کھلی آنکھوں اتنی مرتبہ دیکھنے لگی کہ مجھے یاد ہی نہ رہا اشفاق احمد کو ڈھاکہ گئے کافی دن ہو گئے ہیں۔

پھر شہاب بھائی مجھے ملنے آئے، وہ پرنٹنگ مشین سے آگے نہ بڑھے۔ مہارانی سیتا کی بس یہی حد تھی۔

" آپ کے خان صاحب کا تو ڈھاکہ میں بہت دل لگ گیا ہے رہے تو شاید کرشن چوڑا کے درختوں کو چھوڑ کر نہ آسکیں "۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری مزاح کی حس ویسے بھی کمزور ہے۔

" کرشن چوڑا کیا شہاب بھائی..... ؟ "

" بہت بڑا چھتنار درخت ہوتا ہے۔ اس پر کیسری ' نارنجی پھول لگتے ہیں گچھوں کی شکل میں...... اشفاق کو ان درختوں سے محبت ہو گئی ہے "۔

جوانی میں شوہر کو اگر اپنی ذات سے پرے اخبار بھی اچھا لگے تو اخبار بھی برا لگتا ہے۔

" اعجاز بٹالوی اور اشفاق صبح صبح ناشتے کے وقت پوراپور النگر کیلوں کا کھا جاتے ہیں۔ وہاں کا کیلا اتنا بڑا اور بے حد میٹھا ہوتا ہے...... " شہاب بھائی نے کہنی تک اشارہ کیا۔ ایسے کیلے تو میں نے دیکھے نہ سنے...... پھر پورا لنگر کیلوں کا خریدنا بھی مڈل کلاس کی عورت کے لئے اچھنبے کی بات تھی۔

" دوپہر کے کھانے کے ساتھ ڈاب پیتے ہیں۔ دو دو ڈاب فی کس! "

" ڈاب کیا شہاب بھائی؟ "۔

" کچا ناریل..... بالکل کچا اس کے اندر ابھی اس کی گری دودھیا ہوتی ہے اسے درمیان میں سے کاٹتے ہیں پھر درانتی نما چھری سے ذرا سا کرید دیتے ہیں۔ ناریل سارے کا سار الطیف پانی میں بدل جاتا ہے۔ میٹھا دودھیا رس "۔

" اچھا جی؟ بڑا مزیدار ہوتا ہو گا ناریل کا دودھ "۔

" بہت...... آپ تو وہاں گئی نہیں ورنہ آپ بہت انجوائے کرتیں "۔

میں نے نگاہیں جھکا لیں...... اب میں ان سے کیا کہتی کہ میں ڈھاکہ کیوں نہ گئی؟۔ " شام کے وقت کٹھل کا پھل اور میٹھا دہی..... ہلکا براؤن دہی..... عجیب مٹھاس ہوتی ہے۔ اس میں "۔

نہ میں نے کبھی کٹھل کا پھل کھایا تھا نہ براؤن میٹھے دہی سے میری واقفیت تھی۔

" منیر چوہدری رات کو سب مندوبین گھیر گھار کر کالے داس کی دکان پر لے جاتا ہے، دونے بھر بھر کر سوندیش کھاتے ہیں سب ہر رات؟ "۔

" سوندیش..... وہ کیا ہوتی ہے؟ "۔

" میٹھے پنیر کی مٹھائی ہے بڑی لذیذ..... بس اب آپ اپنے دل کو مضبوط کریں۔ اشفاق تو غالباً مل ملا کر وہیں کاروں کی ایجنسی لے لے گا.... شام کو کبھی جھرنا کا ناچ دیکھتا ہے کبھی کابل کا...... کبھی لیلیٰ ارجمند بانو کے گیت سنتا ہے کبھی فردوسی بیگم کی فارسی غزلیں...... لگتا ہے اب وہ چاٹ گام میں رہے گا کسی سانولی بنگالن کے ساتھ "۔ یکدم میرا چہرہ دیکھ کر شہاب بھائی بالکل چپ ہو گئے۔

عام طور پر انسان ان چیزوں کے ذکر سے بہت گھبراتا ہے جن کے متعلق اس کی معلومات کم ہوتی ہیں۔ ایسی اشیاء جو آپ نے استعمال نہ کی ہوں۔ کسی ایسے علاقے کا ذکر جہاں آپ کو جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ نئے رسم و رواج...... آج کا عہد دراصل انفرمیشن کا عہد ہے جس کے پاس جتنی زیادہ انفرمیشن ہو اور وہ اسے بگھارنے کا فن جانتا ہو اتنا ہی وہ معتبر اور وزنی لگتا ہے۔ میں تب کے مشرقی پاکستان کی اجنبی انفرمیشن سن کر یکدم سٹپٹا گئی اور شہاب بھائی کو معاً احساس ہوا کہ وہ مذاق کو بہت دور لے گئے ہیں اسی وقت غالباً انہوں نے دل میں میری تلافی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا لیکن مجھ پر اپنے خیالات واضح کئے بغیر انہوں نے اجازت لی اور عفت کو ساتھ لانے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

۶۸ء میں انہوں نے عجیب طور پر اس واقعہ کی تلافی کی۔

ان دنوں ہم سمن آباد چھوڑ کر ماڈل ٹاؤن آ بسے تھے۔ گھر کے ارد گرد جیک دی بین سٹاک کی کہانی جیسے درخت لگے تھے۔ شام کے وقت ماڈل ٹاؤن کی سڑکیں بالکل ویران ہو جاتی تھیں۔ ان ویران سڑکوں پر ریاض محمود اپنے سکوٹر پر اور افضال چٹا اور عارف ایک دوسرے سکوٹر پر ہم سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ان دنوں ایکٹر برادری اپنی ناداری ' غفلت ' کسمپرسی کی جھبری پوستین اتار کر بیورو کریٹ برادری کی طرح پائپ منہ میں لے کر پوپیہ پوپیہ چلنا چاہتی تھی۔ شوبز کے لوگوں کو غم تھا کہ بیس سال سے وہ معاشرے کو انٹرٹین کر رہے ہیں لیکن اس کی خوشحالی ' طاقت اور عزت کے کھاتے میں سے کچھ بھی ان کے نام نہیں نکلتا۔ ان دنوں افضال چٹا ابھی قد آور ایکٹر نہیں بنا تھا اس لئے اس کے پاس وارداتوں ' سکیموں ' تقریروں ' خوابوں کے لئے بڑا وقت تھا۔ وہ ہمیں بھی خوب خوب Involved رکھتا۔ الحمرا کے چھوٹے اندرونی ہال میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کے جلسے ہوتے۔ بڑی گہما گہمی جوش و خروش رہتا۔ ان سارے جلسوں کا آنکھوں دیکھا حال افضال چٹا شام کو ہمیں سناتا۔ دراصل یہ ان ہی دنوں کی آرزوؤں کا نتیجہ ہے کہ آج ایکٹر برادری معاشرے کی مونچھ کا بال بنی ہوئی ہے اور ان کی تصویریں چھاپ چھاپ کر رسالے اخباروں کا پیٹ نہیں بھرتا۔

ایک شام افضال دوڑا دوڑا آیا اس کا بغل بچہ عارف جاوید گم سم مسکراہٹوں کے ساتھ کبھی افضال کے دائیں کبھی بائیں ہو کر شمولیت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بچھیرا افضال ہر دولتی میں اس کی طبیعت صاف کر دیتا۔

" آپاں! کل قدرت اللہ شہاب فیصلہ کرنے آ رہے ہیں...... تمام ایکٹروں کی منڈلی ان سے ملے

گی۔ تمام مسائل پیش کئے جائیں۔ پھر ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی"۔

"آپ نے ان کا مضمون civil.lines:Culture پڑھا ہے آپا جی"۔ عارف نے پوچھا۔

"اوئے یہ مضمون بیچ میں کیسے آ گیا؟ کچھ سوچ کر بولا کرؤ" اس کے بعد افضال نے انتونیو کی وہ تقریر پورے اشعاروں کے ساتھ پڑھنی شروع کر دی، جو کھیل جولیس سیزر کی جان ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی افضال کو خیال نہ آیا کہ قدرت اللہ شہاب کے ساتھ انتونیو کی تقریر بیچ میں نہیں آ سکتی لیکن تب افضال کی عادت تھی کہ بات کرتے کرتے یکدم وہ کسی ڈرامے کا حصہ ایکٹ کرنے لگتا۔ کسی کردار میں اپنی صفت کاری سے جان ڈالنے لگتا۔ کچھ دیر کے بعد جب گھٹنے ٹیک 'بازو پھیلا' سر آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر وہ فرینڈز' رومنز اینڈ کنٹری مین کی تقریر کر چکا تو پھر قدرت اللہ شہاب کی طرف رجوع کر گیا۔

"آپاں قدرت اللہ شہاب کچھ گرو ہیں۔ اگر کسی کی رسائی ان تک ہو تو آرٹسٹوں کے لئے وظیفے 'نوکریاں' بیرونی ممالک کے سفر' بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اتنے بڑے آدمی کو ہم میں سے کوئی نہیں جانتا"۔

اس وقت تک مجھے بھی یقین نہ تھا کہ میں ان کو جانتی ہوں اس لئے میں بھی چپ رہی۔

دوسری صبح کچھ ایکٹر شہاب بھائی سے ملے اپنی تمام تصوراتی اور حقیقی تکلیفیں انہیں سنائیں۔ شہاب بھائی پوری توجہ سے سنتے رہے اور کچھ نہ کچھ کرنے کا وعدہ کر کے اسلام آباد چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد مجھے خط ملا، جس میں ایک سرکاری میٹنگ کا دعوت نامہ تھا۔ خان صاحب اور میں جب اسلام آباد شہاب بھائی کے گھر پہنچے تو اس وقت مسعود کھدر پوش اور اشفاق علی خان ان کے "ایل شیپ" بر آمدے میں بیٹھے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے۔ شہاب بھائی نے مجھے صرف اس قدر بریف کیا کہ ایکٹروں کے مسائل اور کلچر کی موجودہ صورت کا جائزہ لینے کے لئے کل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی فیض صاحب اس کے صدر ہوں گے، آپ بھی اس میٹنگ میں مدعو ہیں"۔

تلافی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

دوسری صبح جب شہاب بھائی دفتر جانے لگے تو انہوں نے اپنے پٹیالے کے ڈرائیور سے بڑی آہستہ آواز میں کہا۔ "دس بجے تم بی بی کو لے کر ایجوکیشن والے بلاک میں آ جانا اور گاڑی پر جھنڈا لگائے رکھنا......"۔

تلافی کے ساتھ اعزاز بھی شامل تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ شہاب بھائی اپنی سیاہ مرسڈیز کے سامنے صرف اس وقت جھنڈا لہرانے دیتے تھے جب وہ اس میں سوار ہوتے حتیٰ کہ کئی بار ثاقب بھی ضد کرتا کہ میں جھنڈا کھول کر جاؤں گا تو وہ جھڑک کے بغیر بات رد کر دیتے۔ اس روز ان کی مہربانی واضح تھی۔ وہ ایک پرانا قرضہ بمع سود چکانا چاہتے تھے۔ جس وقت میٹنگ روم میں پہنچی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کمرے میں بڑی معتبر شکل وصورت کے لوگ موجود تھے...... میرے لئے کرسی پیچھے کھینچ کر تنویر احمد خان نے کان میں کہا...... "شہاب صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو میں خوڈنگ آفر کروں......"۔

میں ششدر و حیران تھی۔

پیاز آلو چھیلتی چھیلتی یکدم میں ٹھنڈے کمرے میں لیڈر کی کرسی سے پشت لگائے بیٹھی تھی اور بیچ بیچ کے فیض صاحب مجھ سے تین کرسیاں چھوڑ بائیں آنکھ بند کر کے سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہے تھے۔ کوئی آدھا گھنٹہ باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن کرسی صدارت خالی رہی پھر نظریں جھکائے عاجزی کے ساتھ شہاب بھائی کرسی صدارت پر آ کر بیٹھ گئے۔ "منسٹر صاحب کسی ضروری کام کے سلسلے میں چلے گئے ہیں۔ اس لئے اس نشست کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ آپ لوگوں سے استدعا ہے کہ آرٹ اور کلچر کے ضمن میں اور آرٹسٹوں کی موجودہ حالت سنوارنے کے لئے جو بھی مشورے آپ کے پاس ہوں بلا تکلف دیں"۔

میز پر گیند کو ٹھوکر لگا کر انہوں نے کھلا چھوڑ دیا۔ اب گیند سارے میں لڑھکتا پھرتا تھا۔ کبھی جمیل الدین عالی کے پاس' کبھی فیض صاحب کے آگے...... کبھی قمر الحسن کی سمت میں...... پہلے جلسے کے بعد شہاب بھائی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اپنی بھانجی گڈی سے کہا کرتے تھے...... اگر چپ رہنے سے گزارہ چل سکے تو خاموشی پہلا Option ہونا چاہئے۔

تمہارے پاس ہمیشہ دو چوائس ہوتے ہیں۔ بولنا اور چپ رہنا...... دوسری چوائس پہلی سے بہتر ہے۔

اس میٹنگ کے دوران کئی مسائل زیر بحث آئے۔ پھر Standing Committee Art & Culture تشکیل پائی۔ فیض صاحب اس کے صدر تھے۔ صلاح الدین' قمر الحسن اور ایک خاتون مسز کبیر جو اس وقت نہ تو میٹنگ میں موجود تھیں نہ بعد میں کبھی نظر آئیں، مشرقی پاکستان کے نمائندے منتخب ہوئے۔ جمیل الدین عالی صاحب مغربی پاکستان کی جانب سے سلیکٹ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ اپنے بھانویں کمیٹی مکمل ہو چکی تھی لیکن شہاب بھائی اپنی مدہم آواز میں بولے...... "میں بانو قدسیہ کا نام پروپوز کرتا ہوں......"۔

پتہ نہیں کس گوشے سے تنویر احمد خان کی آواز آئی...... آئی سیکنڈ دی موشن......"۔

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں کس طرح میٹنگ میں منتخب ہوئی۔ شہاب صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فیض صاحب سے پوچھا...... "لیکن میں سمجھی نہیں ہم لوگ کریں گے کیا؟......"

بھئی تم جاہل لگتی ہو...... کرنا کیا ہے؟ ہم لوگ پشاور' لاہور' کراچی' ڈھاکہ' حیدر آباد وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ وہاں کے ایکٹروں سے ملیں گے...... کونسلیں دیکھیں گے۔ بعد میں رپورٹ کر دیں گے حکومت کو......"۔

فیض صاحب کے جواب نے مجھے اور بھی گڑبڑا دیا۔ جب میں کار میں شہاب صاحب کے ساتھ واپس آ رہی تھی تو میں نے ان سے پوچھا...... "شہاب بھائی لیکن سٹینڈنگ کمیٹی آخر کیا کرے گی؟ اس کے objectives کیا ہیں؟"۔

وہ مدہم سا مسکرائے اور آشیرباد کے انداز میں ذرا سا ہاتھ اٹھا کر بولے...... "آپ کو ڈھاکہ دیکھنے کا شوق ہے ناں بس وہ دیکھ آیئے فی الحال آپ کا یہی objective ہے...... باقی تمام کام فیض صاحب کر لیں گے"۔

شہاب بھائی اور خان صاحب میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے رنگ کے گونگے آدمی رہے ہیں اور شاید اسی لئے انہیں ایک دوسرے کی صحبت میں راحت ملتی تھی۔ شہاب بھائی کا گونگاپن تکلیف دہ نہیں تھا۔ یوں نہیں لگتا تھا جیسے وہ آپ کو کمتر سمجھ کر آپ سے کچھ چھپا رہے ہیں یا وہ اپنی ذاتی زندگی کو صیغہ راز میں رکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ ایک سوئے ہوئے معصوم بچے کی طرح بڑی بے ضرر خاموشی سے وقت بسر کرتے تھے۔ اپنے ہر فین کا جواب پہلی مرتبہ ضرور دیتے۔ عورتوں سے ان کے بچوں کا حال پوچھتے۔ مردوں سے ان کی روزی' ترقی گریڈ' بالا افسر' زیر دست ملازم کے حالات دریافت کرتے۔ نصیحت آمیز گفتگو سے کبھی بات چیت کو بوجھل نہ کرتے۔ جب نوجوان ان سے بولتے تو بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتے رہتے...... ہر مکالمے میں خاموشی' رواداری اور کم سے کم گفتگو سے شمولیت کرتے۔

خان صاحب کی خاموشی تضاد سے جنم لیتی ہے۔ وہ طبعاً خاموش ہیں' لیکن مروت کے طور پر' دوسرے کا دل لگانے کی خاطر اپنا آپ چھپانے کے ضمن میں بولتے ہیں ان کی گفتگو ایک پردہ ہے' حجاب ہے۔ وہ اسی گفتگو کے سہارے دوسروں کو اپنے بہت قریب آنے سے روک سکتے ہیں۔ میں چونکہ خلوت کی قدر کرتی ہوں اس لئے نہ میں نے خان صاحب کے پردوں سے اندر جھانکا نہ ہی شہاب صاحب کی خاموش چلمن کو سرکانا چاہا۔ ممکن ہے کہ شہاب صاحب اور خان صاحب دونوں ایک دوسرے کے سربستہ رازوں سے واقف ہوں لیکن اس کی سوہ کسی تیسرے کو نہیں لگ سکتی۔ چونکہ میں شہاب بھائی کو قیافوں سے جانتی ہوں اور اشفاق خان نے اپنے وجود کے گرد گفتگو کی باڑھ لگا رکھی ہے'

اس لئے آج تک مجھے علم نہ ہو سکا کہ شہاب بھائی کو خان کس حد تک' کیسے اور کیوں کر جانتے تھے؟۔

شہاب بھائی کا معمول تھا کہ جب وہ لاہور آتے تو ہمیشہ داستان سرائے میں ٹھہرتے۔ اگر وہ کار سے آتے تو کبھی گھنٹی نہ بجاتے۔ اگر ہوائی جہاز یا ٹرین سے ان کی آمد ہوتی تو بھی وہ کبھی گھنٹی پر ہاتھ نہ رکھتے۔ اشیر خان ہی عجلت میں گھنٹیاں بجاتے اور اگر ڈرائیور ساتھ ہوتا تو وہی یہ تیزیاں دکھاتا۔ شہاب بھائی پورے پندرہ برس داستان سرائے آئے۔ میں نے کبھی انہیں گھنٹی بجا کر اندر آتے نہیں دیکھا۔

اگر وہ کسی چھوٹے سے ذاتی کام یا سیر کے لئے بھی باہر جاتے تو واپسی پر ہمیشہ لمبا اور گلی کا بغلی دروازہ اختیار کرتے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پچھلے برآمدے کے دروازے تک پہنچ جاتے۔ اگر دروازہ کھلا پاتے تو اندر آ جاتے ورنہ اندر والی لان میں ٹہلنے لگتے۔ پھر جب کوئی برآمدے میں اچانک آتا تو ان کے لئے دروازہ کھول دیتا۔ دروازہ کھلنے پر انہوں نے کبھی شکایت نہ کی کہ "بھئی میں تو پون گھنٹے سے کھڑا ہوں تم لوگ کہاں تھے یا یوں کہ گرمی بڑی تھی بڑی تکلیف ہوئی"۔

شہاب بھائی کسی پر بوجھ ڈال کر' گلہ گزاری کے ساتھ احسان جتا کر' اپنی اہمیت نہ بناتے تھے۔ وہ بڑے سادہارن طریق سے آتے اور ترنت اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ہمارے گھر کے بڑے پھاٹک سے ملحق پہلا کمرہ شہاب بھائی کا تھا۔ ہم اب بھی اسے شہاب بھائی کا کمرہ کہتے ہیں۔ اس کمرے میں کاسنی قالین' دو عدد سادہ سفید پلنگ' ایک چالیس سالہ پرانی سفید ڈریسنگ ٹیبل جس پر عام طور پر خالی پاؤڈر کا ڈبہ' کسی لڑکی کا بھولا بسرا ہیئر برش اور ایک چھوٹا لمبوترا پیتل کا خالی گلدان دھرا رہتا ہے۔ شہاب بھائی اسی ڈریسنگ ٹیبل پر اپنا چھوٹا سا زپ والا بیگ رکھا کرتے۔ شروع شروع میں وہ اپنا تولیہ اور نائٹ سوٹ ساتھ نہیں لاتے تھے۔ لیکن کچھ سفروں کے بعد شاید انہیں علم ہو گیا کہ صاف تولئے کے لئے بڑی ڈھونڈیا پڑتی ہے تو وہ بغیر بتائے اگلی بار سے اپنا سبز ٹکڑیوں والا تولیہ ساتھ لانے لگے۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل پر چھوٹا بیگ چھوٹی میز پر الارم کی گھڑی اور سپیئر پلنگ پر اپنے کپڑوں والا بیگ رکھتے۔ شہاب بھائی عام طور پر سلیپر ساتھ نہیں لاتے تھے۔ وہ کوئی معمولی چیز مانگ کر میزبان کو بڑا اشرف بڑی اپنائیت بخشتے تھے۔ ان کے سامان میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہوتیں۔ کئی بار سلیپر بھی ساتھ ہوتے لیکن وہ دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ کہتے "اشفاق سلیپر ہے کوئی؟"۔

یہ سن کر سارے افراد خانہ اپنے اپنے سلیپر ان کے پیروں تک پہنچانا چاہتے۔ اسی ضمن میں مجھے یاد آیا کہ ایک بار میرے بڑے بیٹے انیق خان نے اپنے سلیپر انہیں دیئے۔ یہ سلیپر انار کلی سے ایک ایسی ریڑھی کی خرید تھی جس کا دکاندار سلیپروں کا سائز دیکھنے کے لئے بھی انہیں ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔ انیق خان کے سلیپر ربڑ نما پلاسٹک کے تھے اور نیچے سے ان میں ایسی جھریاں بنی تھیں کہ پانی ان میں کھڑا

ہو جاتا تھا۔

ایک روز شہاب بھائی باورچی خانے میں آتے ہوئے بولے " یار اشفاق یہ کیسے سلیپر ہیں؟"۔

"کیوں کیا ہوا؟"۔

" آج صبح جب میں وضو کر رہا تھا تو مجھے چوں چوں کی آواز آئی۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی چوہا ہے۔ میں بیڈروم میں آ گیا لیکن آواز ختم نہ ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ آواز سلیپروں سے آتی ہے"۔

خان صاحب کو Anecdotes بیان کرنے کا جو ملکہ ہے وہ اس درجہ خداداد ہے کہ کوئی اور اگر ان کا بتایا ہوا واقعہ دوبارہ سنائے تو بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہاں انہوں نے ریڑھی والے کا رویہ خاص اور جوتی کے چناؤ پر اتنی خوبصورت گفتگو کی کہ ہمیں بھول گیا انیق خان شرمندہ سے کھڑے جوتی واپس لینے کے متعلق جملے بنا رہے ہیں اور کہہ نہیں پاتے...... پتہ نہیں یہ خان صاحب کی ہار سنگار جیسی گفتگو تھی یا دونوں میں چپ کا گہرا رشتہ تھا۔ لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں ساتھ ساتھ رہنا پسند کرتے۔ ایک روز بازار سے واپسی پر شہاب بھائی بولے۔ "بانو...... ہو سکا تو آج کے بعد میں اشفاق کے ساتھ بازار نہیں جاؤں گا...... یہ بہت تیز چلتا ہے اور میں پیچھے رہ جاتا ہوں۔ یہ بہت بھاؤ تاؤ کرتا ہے اور مجھے الجھن ہوتی ہے......"۔

"ہائے کیوں شہاب بھائی"۔

" آج ہم ایک لوٹا خریدنے گئے تھے...... ساری انارکلی، سارا موچی گیٹ گھوم پھر آئے...... لیکن لوٹا نہیں ملا......"۔

"ایک معمولی ٹونٹی والا لوٹا نہیں ملا......؟" میں نے سوال کیا۔

"اگر میں ہوتا تو پہلی دکان سے لوٹا خریدتا اور گھر آ جاتا لیکن تمہارا شوہر تحقیق کا آدمی ہے۔ کسی دکان پر لوٹے میں پانی بھروا کر اس کی دھار دیکھتا تھا۔ کسی دکان میں ٹونٹی کے ساتھ منہ لگا کر سانس چھوڑتا تھا۔ کسی لوٹے کا رنگ اچھا نہ نکلا، کسی کی بناوٹ، اس لئے ہم دونوں بے پیندے کے واپس آ گئے خالی ہاتھ......"۔

باوجودیکہ لوٹے کی خریداری میں شہاب بھائی کو بڑا عذاب اٹھانا پڑا لیکن پھر بھی وہ خان صاحب کے ساتھ بازار جانا پسند کرتے رہے۔ جب خان بھاؤ تاؤ کرتے اور اس کر اس ٹاک میں دکاندار سے سیاست، علم، آزادی نسواں تک کی رائے معلوم کر لیتے تو شہاب بھائی پاس کھڑے بڑی حیرت، خوشی اور دلچسپی سے باتیں سنتے نظر آتے۔ انہوں نے کبھی دخل در معقولات نہیں کی...... نہ ہی خان صاحب کے اس شغل پر اعتراض کیا۔ جب پھل کار میں لد جاتے اور وہ فرنٹ سیٹ پر خان کے ساتھ بیٹھتے تو کبھی کبھار کہتے " یار جب تو دکاندار کو پیسے زیادہ دے آتا ہے اور اس کی منہ مانگی قیمت ہی بالآخر دیتا ہے تو اتنی

بحث کیوں کرتا ہے"۔

خان صاحب جواب دیتے "اگر مول تول نہ کروں...... سودے پر تبصرہ نہ ہو تو دکاندار میرے قریب کیسے آئے؟ میں اس سے باتیں کیسے کروں؟ اس کی رائے کیسے معلوم کی جائے؟ سیاست پر...... اسلام پر...... بجٹ پر...... عورتوں پر...... آج کے اسباب زوال امت پر؟"۔

جس وقت شہاب بھائی کاسنی کمرے میں اترتے تو اس کے بعد سب لوگ اس حجرے کے پاس سے خاموشی سے آنے جانے لگتے۔ انہوں نے کبھی کسی کو ٹوکا نہیں۔ شور مچانے دنگا فساد کرنے سے منع نہیں کیا لیکن جب وہ کاسنی خلوت خانے میں ہوتے تو خود بخود آوازیں دھیمی پڑ جاتیں لڑکیاں ہنستے ہنستے رک کر پوچھتیں "انکل شہاب اندر ہیں؟"۔ نوجوان ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتے "چلو یار باہر چلیں انکل شہاب سو رہے ہیں سڑک پر کرکٹ ہوگی......"۔

شہاب بھائی ضرورت کی چھوٹی چیزیں مانگ کر میزبان کا مان بڑھاتے تھے لیکن الارم والی گھڑی انہوں نے کبھی نہیں مانگی ہر سفر پر یہ ان کے ساتھ ہوتی۔ رات کے پچھلے پہر تہجد سے کچھ پہلے اس کی ہلکی سی ٹنک ٹنک سنائی دیتی پھر وہ یکدم بند ہو جاتی...... اس کے بعد نہ جانے ان کے معمولات کیا ہوتے؟ لیکن سورج چڑھنے سے بہت پہلے وہ سیر کے لئے نکل جاتے۔ اس سیر کے لئے انہیں انیق خان نے ایک بڑی طرحدار چھڑی بنا کر دی تھی جو وہ ساتھ لے جاتے کیونکہ ماڈل ٹاؤن کے آوارہ کتے ناہنجار بھی تھے اور زبان دراز بھی...... رات ہی کو وہ پھاٹک کی چابیاں اپنی الارم کی گھڑی کے پاس یا فیوز باکس میں لٹکا لیتے...... ان کی کسی احتیاط میں اصرار نہ تھا۔ نہ ہی وہ چابیوں کے لئے کبھی شور مچاتے...... "اوہ بھئی چابیاں کہاں ہیں؟۔ رات کو کہاں رکھتے ہو چابیاں...... مجھے دے کر کیوں نہیں سوتے؟" وہ چوری چوری رات ہی کو چابیوں کا اہتمام کر لیتے۔ صبح دبے پاؤں اٹھتے، برآمدے میں سے گزرتے، کالے پھاٹک کا تالا کھولتے اور سیر کو نکل جاتے۔

شہاب بھائی انجائنا کے مریض تھے انہیں برسوں سے شوگر آتی تھی ان کی ایک ٹانگ کے سارے اعصاب خراب تھے وہ ہر سال معائنے کے لئے لندن جاتے اور جو کچھ ڈاکٹر کہتا من و عن اس پر عمل کرتے۔ شہاب بھائی نہ تو اس لئے علاج کرواتے تھے کہ انہیں اس اپائے پر اعتماد تھا۔ نہ ہی اس لئے لندن عازم ہوتے کہ وہاں کا دوا دارو بہتر تھا۔ بس وہ ماننے والوں میں سے تھے اور علاج کے معاملے میں جو حدود مقرر ہو گئی تھیں ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر ان کے بڑوں نے بیماری میں کوئی چارہ کروایا تو وہ بھی علاج معالجہ کے لئے حاضر تھے...... پہلے پہل جس ڈاکٹر سے لندن میں بن باس کے دنوں ملاقات ہوگئی اسی کا بندوبست جاری رکھا۔ وہ ڈاکٹروں پر اعتماد کئے بغیر ان کا حکم مانتے رہے ایک حکم اس میں سیر کا بھی تھا۔

شہاب بھائی کو سیر پسند نہ تھی۔ جس روز گرج چمک کے ساتھ مینہ برستا یا مئی کے مہینے کی گلابی آندھیاں چلتیں، وہ صبح بہت خوش ہوتے اور اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے کہتے "آج تو سیر سے چھٹی ہو گئی......"۔

یہ نہیں کہ وہ ان مانے جی سے سیر کرتے تھے۔ ان مانے جی سے انہوں نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ ناپسندیدہ عمل بھی بوقت ضرورت بڑی خوشدلی سے نپٹا لیتے تھے...... ان کے پاس نیلے رنگ کی ایک گول سی ڈبیا تھی۔ سیر سے واپسی پر وہ اپنے کمرے میں جاتے اس ڈبیا میں سرخ نارنجی سفید' براؤن کئی قسم کی گولیاں ڈالتے' ڈبیا کو احتیاط سے اٹھاتے اور باورچی خانے میں آ جاتے۔ ان گولیوں کو دیکھ کر ہمیں تعجب ہوتا...... کئی بار تو وہ ہماری حیرت کو نظر انداز کر دیتے لیکن کبھی کبھی کہتے۔ "یہ کئی قسم کی گولیاں ہیں۔ کچھ انجائنا کے لئے...... کچھ اس ٹانگ کے لئے جس کی حسیات ختم ہو چکی ہیں اور کچھ شوگر کے لئے......"۔

"کیا آپ کو ان دوائیوں پر اعتماد ہے شہاب بھائی"۔ میں پوچھتی۔

"ڈاکٹر ہم سے بہتر جانتا ہے کم از کم علاج کے ضمن میں...... ہمیں اعتبار کرنا چاہئے۔ اور پھر اگر انہوں نے بیماری میں توڑ کیا تو ہمیں حد کراس نہیں کرنی چاہئے"۔ میں نے شہاب بھائی کو کبھی رسول اللہ کا نام لیتے نہیں سنا۔ وہ اس ذات سے بہت جھینپتے تھے اور ان کا ذکر سنتے ہوئے بھی ان پر شرمساری طاری ہو جاتی تھی۔ اگر کبھی اتفاقاً تذکرہ آ بھی جاتا تو ان کے ماتھے پر عرق انفعال ضرور چمکتا۔ لگتا جیسے کوئی پردہ فاش ہو گیا ہو۔

چہل قدمی سے واپسی پر ان کے ساتھ عام طور پر چھوٹا سا کوئی واقعہ بھی ہمراہ ہوتا جو انہیں مطالعہ قدرت کے دوران پیش آیا ہوتا۔ کوٹھیوں کے نام' دھوبی گھاٹ' راہ میں ملنے والے دوسرے سیر کے شوقین' دودھ لے جانے والے گجر' اخبار تقسیم کرنے والے نوجوان' کسی کسی گھر میں صبح کے وقت ٹیکسی یا کار سے اترنے والی سواریاں' راستوں پر کوئی کوئی کھلا نلکا اور تقریباً بھی بند گیٹ...... الشیر کی باڑھوں سے پھر سے اڑ جانے والے پرندے' دیر تک جلتے رہنے والے سڑک کے قمقمے...... وہ اس ہواخوری سے کچھ نہ کچھ چن کر ہمارے لئے ضرور لاتے تھے۔ ان کا مشاہدہ اتنا تیز تھا کہ ہر نئی دیکھ کے ساتھ پرانا تجربہ ملا کر ایسی ایسی خوش رنگ اور مزاح آمیز گفتگو کرتے کہ صبح صبح دل تمام کدورتوں سے پاک ہو جاتا۔ بات شروع کرتے...... "اشفاق...... اگر تمہارے گھر سے دائیں طرف مڑ کر چلنا شروع کر دو تو پہلے کراسنگ کے پاس نرسری آتی ہے اس سڑک پر کوئی سو قدم کے بعد ایک ھونٹڈ ہاؤس ہے۔ آج اس کے سامنے میں نے ایک دودھ والے کو کمیٹی کے نلکے سے دودھ میں پانی ملاتے دیکھا۔ دودھ میں پانی ملانے کے بعد آمیزش والا دودھ ہتھیلی میں ڈالا اور بڑے لطف سے اسے چکھا"۔

شہاب بھائی کے چہرے پر ہلکی سی شرارت من موہنی مسکراہٹ اور ادیب کی گہری جانچ پڑتال آ جاتی۔ وہ ایک معمولی واقع کو بڑی خوبصورت تفصیل' جاندار تجزیئے اور تازگی سے بیان کرتے۔ سیر کے ساتھ وہ یہ پھول ہمارے لئے چن کر لاتے اور ان کا ہر کیف نظارہ ہمارے لئے ایک واقعہ بن جاتا۔

شروع شروع میں شہاب بھائی کی اس مارننگ ٹاک کی میں عادی نہ تھی۔ کیونکہ اس میں خان صاحب جیسی چمک اور ہیومر نہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہی صبح کی چائے کا وقت ایسا ہو گیا جب خان صاحب اور میں شہاب بھائی کو مکمل طور پر شیئر کرتے، ان کی سنتے اور ان کی برکت کے سائبان تلے آرام سے بیٹھتے اور زندگی گزارنے میں سہولت محسوس کرتے۔

شہاب بھائی کی باتوں میں جو سہولت اور لذت محسوس ہونے لگی یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ کچھ وقت ایسے بھی ان کے ساتھ آتے تھے جب میں مارے عزت کے کمرہ چھوڑ جاتی تھی لیکن اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ یہ وقت وہ تھا جب خان شہاب بھائی کے پاؤں ہاتھ میں لے کر نیچے بیٹھتے اور عینک لگا کر ان کے ناخنوں کو دیکھنے لگتے۔ وجہ یہ تھی کہ شہاب بھائی کے انگوٹھوں میں جو ناخن اگتے ایسے ناہنجار ہوتے کہ سیدھا باہر نکلنے کے بجائے اندر کی طرف مڑ کر گوشت میں پیوست ہونے لگتے۔ یہ ناخن خان صاحب بڑی پریت سے' جیسے کوئی لڑکی گڑیا کو کپڑے پہناتی ہے' کاٹا کرتے تھے' وہ بار بار پلائیر نما نیل کٹر کو جانچتے شہاب بھائی کا چہرہ دیکھتے اور پھر ہاتھ تول کر ناخن کاٹنے لگتے۔ شہاب بھائی بڑے تشکر سے کہتے۔ "یار اشفاق جب سے تم میرے پیڈی کیورسٹ بنے ہو مجھے بڑا آرام ہو گیا ہے ورنہ کئی بار تو مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا تھا جب تک لندن جانے کی صورت نہ پیدا ہو"۔ شہاب بھائی ناخن کٹواتے رہتے' خان ناخن کاٹتے رہتے اور میں کمرے سے باہر سوچتی کیا یہ عمل ضروری ہے؟۔ جب شہاب بھائی سکھی سے ہو کر اپنے کاسنی کمرے میں چلے جاتے تو میں خان صاحب سے کہتی...... "میں نے سنا ہے باٹا کے اوپر ایک قابل پیڈی کیورسٹ بیٹھتا ہے آپ شہاب بھائی کو وہاں کیوں نہیں لے جاتے؟۔ جب آپ یوں سر جھکا کر ان کے پیروں میں بیٹھتے ہیں تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے"۔ خان لاتعلقی سے کہتے...... "تمہیں معلوم نہیں شہاب کی جلد بہت نرم اور ناخن بہت سخت ہیں قدسیہ انہیں مجھ سے بہتر اور احتیاط کے ساتھ کوئی نہیں کاٹ سکتا"۔ ایک بار جب ناخن کٹ گئے اور شہاب بھائی نے سکھ کا سانس لیا تو قدرے توقف کے بعد وہ بولے...... "اشفاق یار زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کیا پتہ تیری میری لڑائی ہو جائے اور ہماری بول چال ہی بند ہو جائے لیکن یار میری ریکوسٹ ہے کہ میرے ناخن کاٹنے نہ چھوڑنا۔ تب خان کے اس عمل کے ساتھ میں متفق نہیں تھی اس لئے میں نے اس کمرے میں رہنا چھوڑ دیا۔ پھر وقت گزرنے پر' کچھ اور جہتیں کھلنے پر' پردے اٹھنے کے بعد' تھوڑی سی راہ ملنے پر میرا رویہ بالکل بدل گیا۔ اب خان صاحب اسلام آباد جانے لگتے تو میں پوچھتی...... "خان...... وہ ناخن کاٹنے والی کٹ ساتھ رکھ دوں؟"۔

شہاب بھائی لاہور آتے تو میں کہتی "خان جی...... شہاب بھائی سے پوچھ لیں ناخن تنگ نہ کرتے ہوں...... "۔ جب خان صاحب ناخن کاٹ رہے ہوتے تو میں بولتی رہتی "یہ کٹر بالکل بے کار ہے اتنا زور لگتا ہے خان صاحب آپ پلیز جاوید طارق سے کہیں وہ باہر آتا جاتا رہتا ہے ایک کٹ تو لے آئے مناسب قسم کی...... "۔

یہ فقیر لوگ بڑے ڈاہڈے ہوتے ہیں آپ کے دشمن سے جپھیّ ڈلوا کر رہتے ہیں۔ جہاں آپ شادی نہیں کرنا چاہتے وہیں کروا دیتے ہیں۔ جس بیوی کو آپ چھوڑنا چاہتے ہیں اسے ہی پٹ رانی بنا دیتے ہیں۔ ساگ پات' بینگنے 'کھیرے 'چٹنی' روٹی آپ کی خوراک بن جاتی ہے۔ لوگوں کا پاشویہ کر کے آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا ہی احسان ہے کہ پاؤں دھونے کو دیئے۔ آپ کو پتہ نہیں چلتا اور آدھی رات کو آپ کی آنکھ کھلنے لگتی ہے۔ خیرات لینے والوں کا شکریہ ادا کر کے راحت ملتی ہے۔ لوگوں کا گلہ سن کر چپ رہنے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ یہ ڈاہڈے لوگ اوکھے لوگوں کے ساتھ اور بھی ڈاہڈے ہوتے ہیں۔ خان صاحب بابا نور والے کے ڈیرے پر جایا کرتے تھے۔ ایک بار شہاب بھائی نے مجھے ہنس کر کہا...... "بانو اشفاق ڈیرے پر بڑی باقاعدگی سے جاتا ہے۔ یہ ڈاہڈے لوگ ہوتے ہیں یہ فقیر باباجی جیسے...... روٹی بوٹی کھلاتے ہیں اور انسان اپنے دانتوں سے اپنی قبر تیار کر لیتا ہے۔ یہ گھسیٹ گھساٹ کر' تتو تھمبو کر کے' پیار ویار سے ادھر کے رستے پر ڈال دیتے ہیں پھر پروا نہیں کرتے کہ آپ پر کیا بیت جاتی ہے۔ ان کا بس اتنا ہی کام ہے۔ کھوئی ہوئی بھیڑیں جمع کرنا...... راستے پر ڈالنا اور بس پھر بھیڑ جانے اور بھیڑوں والا جانے یہ پروا نہیں کرتے۔

شہاب بھائی کے جانے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ بھی بڑے ڈاہڈے تھے انہوں نے بھی خان صاحب کے ساتھ اچھی کی...... پریت سے ناخن کٹوائے۔ بن بولے تشکر سے موم کیا...... بھیڑ کو جنگلوں کے راستے پر ڈالا اور اپنے کندھے پر بھورا ڈال رخصت ہو گئے۔ میں ان دونوں کے اندرونی رابطے کو نہیں سمجھ سکی۔ شاید کچھ تھا...... شاید نہ تھا۔ میں یہاں اشفاق احمد کا ایک مضمون جو انہوں نے پشاور میں پڑھا من و عن لکھتی ہوں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ خان کا رشتہ شہاب بھائی کے ساتھ کیسا تھا؟۔ اس میں کتنی دوستی' کیسی رفاقت اور کس قدر عاجزانہ خود سپردگی تھی؟۔

"چندن کا پیڑ"

میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات کہہ دینی چاہئے اور اس کے کہنے میں کسی قسم کی معذرت کو یا کسی حیلے کو سہارا نہیں بنانا چاہئے اور کسی عذر خواہی کے بغیر اس کا اعلان کر دینا چاہئے کہ میں قدرت اللہ شہاب صاحب کا خلیفہ ہوں اور واحد خلیفہ ہوں کیونکہ انہوں نے خود اپنی زبان سے دو مرتبہ واشگاف الفاظ میں بیان دیا تھا کہ "اشفاق احمد میرا خلیفہ ہے۔ میں اس کو اپنے خلیفے کے طور پر قبول کرتا ہوں' اور اس کے لئے دعا کرتا ہوں...... " پھر انہوں نے میری بیوی سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ میں اشفاق کے لئے اور اس کے گھرانے کے لئے اور اس کے بچوں کے لئے دعا کرتا رہوں گا اور خداوند کریم سے چاہوں گا کہ وہ میری دعائیں قبول فرمائے اور اس کے گھرانے کو خیر کثیر عطا فرمائے۔

جب دعا ہو چکی تو میری بیوی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا "اب اس بات کو چھپا کر رکھنا اور کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کرنا اور نہ ہی وہ عمل کرنا جس سے کسی کو شک پڑے کہ تم ان کے خلیفہ ہو اور تم کو انہوں نے اپنی خلافت کے لئے چن لیا ہے"۔

دراصل میری بیوی کو اور ممتاز مفتی کو شروع ہی سے قدرت اللہ شہاب کے نام سے چڑ تھی اور مجھے ان دونوں کی آنکھ بچا کر شہاب سے ایسی پوشیدہ جگہوں پر ملنا پڑتا تھا جہاں کسی کو گمان بھی نہ گزرے کہ ایسی غیر مہذب اور غیر معزز جگہوں پر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لمبی لمبی سہپہریں اور چھوٹی چھوٹی مغربیں گزار سکتے ہیں۔ دراصل ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ لمبی لمبی بلکہ بہت ہی لمبی باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا جن میں عام طور پر چھوٹی بڑی کمینگیوں کے تفصیلی تذکرے ہوتے تھے اور ان میں بہت سے جانے پہچانے نام کپڑے دھونے والی مشین میں جپھیّاں ڈالتے اور دھکے دیتے کپڑوں کی طرح گھومتے رہتے تھے۔ کئی سال بعد ابن انشاء بھی ہمارے ساتھ آ ملا اور ہمارا عملہ ادارت اور بھی فعال ہو گیا۔ بانو قدسیہ کو ہماری سنگت کا ابن انشاء بہت پسند آیا لیکن قدرت اللہ شہاب سے وہ بدستور کشیدہ رہی۔

ممتاز مفتی کو اور میری بیوی کو اونچے درجے کے سرکاری افسروں سے ایک عجیب طرح کی کد تھی۔ ممتاز مفتی ہر بڑے افسر اور نامی گرامی بیوروکریٹ سے اس وقت تک نہ کھلتا تھا جب تک کہ ٹھبی مار کر اس کو نیچے نہ گرا لیتا اور اس کی چھاتی پر اپنا دائیں پیر رکھ کر یہ صدا بلند نہ کر لیتا کہ "بھئی ہمارے لئے کہیں سے دو کرسیاں بھجواؤ۔ بڑے صاحب تشریف لائے ہیں۔ ان کے لئے کوئی چائے پانی کا بندوبست کرو"۔ اور بانو قدسیہ کو صرف یہ خوف رہتا تھا کہ لوگ دیکھیں گے تو افسر بازی کا طعنہ دیں گے اور کہیں گے کہ ان لوگوں نے اپنی زندگی اپنی محنت سے خود نہیں بنائی بلکہ افسروں کے رسوخ کی وجہ سے سفارشی سہارے پر بنائی ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کے اپنے ہاتھ پلے کچھ نہیں افسروں کے کاسہ لیس ہیں اور مشکل یہ تھی کہ شہاب نہ صرف ایک افسر تھا بلکہ بہت بڑا افسر تھا۔ کسی حد تک سب سے بڑا تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد صدر مملکت آ جاتا تھا اور پھر مملکت خداداد کی حدیں ختم ہو جاتی تھیں...... بانو قدسیہ کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے شہاب صاحب کو ریٹائر ہو لینے دو ان کو ایک بے معنی' بے کار' بے وسیلہ اور بے حال شخص بن لینے دو پھر میں ان کی طرف رجوع کروں گی اور ممتاز کی مشکل یہ تھی کہ وہ کئی ٹھبیاں چلا چکا تھا اپنے ساتوں داؤ استعمال کر چکا تھا لیکن شہاب ڈھیتا نہیں تھا۔ ڈھیتا اس لئے نہیں تھا کہ اس نے کبھی خم ہی نہ ٹھونکا تھا۔ اکھاڑے میں ہی نہ اترا تھا۔ بڑھک ہی نہ ماری تھی۔ دعویٰ ہی نہیں کیا تھا۔ مفتی پریشان تھا اور بانو محجوب تھی اور میں خوش تھا کہ اپنے ان دو پیاروں کو ایک طرف کر کے مجھے شہاب سے ملنے کا وافر وقت مل رہا ہے اور گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہے۔

اصل میں آج تک میرے سارے کام انسانوں نے ہی کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لطف بے پایاں اور خیر کثیر کے مجھ تک پہنچنے کا سامان ہمیشہ بندوں نے ہی کیا ہے۔ بیماری میں میرا علاج ہمیشہ کسی انسان نے کیا۔ باعزت طور پر بری انسان نے کیا...... نعمتیں ہمیشہ بندے ہی اٹھا کر' دھو کر' کاٹ کر' سجا کر لائے۔ جب اللہ نے مجھے خوش کرنا چاہا تو لوگوں سے ہی تالی بجوائی۔ جب مجھے محبت عطا کرنی چاہی تو کسی شخص سے ہی مجھے جپھی ڈلوائی۔ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تو ایک بندے کو ہی میرا پائلٹ بنایا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی تو پے کلرک نے ہی مجھے پیسے لا کر دیئے۔ لیمن جوس مجھے ہمیشہ ایئر ہوسٹس نے پلایا اور میاں محمد صاحب کے شعر مجھے بندے نے ہی سنائے۔ اس کا فضل اور اس کا کرم مجھ پر ہمیشہ کسی انسان کی معرفت ہی پہنچا۔

لیکن شہاب تو ان سب بندوں سے ان سب آدمیوں سے بہت ہی مختلف تھا۔ وہ انعام

بر اور فضل بردار نہیں تھا۔ خود انعام اور خود فضل تھا۔ یہ بات میں کسی روحانی سلسلے یا تصوف کے حوالے سے نہیں کہہ رہا۔ خالص دنیاداری کے رخ سے کہہ رہا ہوں کہ شہاب کے قریب رہنا خیر کے ساتھ رہنا تھا اور اس کے ساتھ منسلک ہونا ہر طرح کی یافت سے وابستہ ہونا تھا۔ کبھی کبھی اخباروں میں چھپتا ہے یا لوگوں کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ شہاب کے یاروں نے اس کی ذات سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ واقعی جو بھی اس کا یار تھا خوش قسمت تھا جو بھی اس کے قریب تھا مالا مال تھا۔ ہم نے اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ اتنا فائدہ کہ کوئی انسان کسی انسان سے اٹھا ہی نہیں سکتا۔ مال و منال' فارغ البال' پرباش ہم تو بہت قریب کے لوگ ہیں جو شخص اس کے پاس سے بھی گذر گیا یا اس کے خیال سے بھی گذرا اس کی زندگی بھی سپھل ہو گئی۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کب اور کس وقت اور کس مقام پر ممتاز مفتی اور بانو قدسیہ نے نیا جنم لیا البتہ سردیوں کی وہ صبح اچھی طرح سے یاد ہے جب بانو نے بڑی لجاجت سے کہا "میری ایک بات مانیں گے"۔ تو میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا "آپ شہاب بھائی کو "تو" اور "تم" کہہ کر نہ پکارا کریں اور اگر کہنا ہی ہو تو کم از کم میرے سامنے نہ کہا کریں"۔

پھر ممتاز مفتی نے اپنے سیٹلائٹ ٹاؤن والے پہلے گھر میں گرج کر کہا "اوئے تم اندھے ہو؟ بہرے ہو؟ تمہارے وجود کے سارے رستے سیل بند ہو چکے ہیں کیا...... اوئے تم کو نظر نہیں آتا کہ وہ کون ہے۔ بگڑے ہوئے وجود کیا تمہاری ذات کے سارے ہی انٹینے اور ایریل شارٹ سرکٹ ہو گئے ہیں...... تم انسان ہو کہ کیا ہو اوئے"۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ مفتی کے کہنے کے باوصف اور اپنا سارا زور لگانے کے باوجود مجھے تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں کچھ ایسا ڈفر بھی نہیں ہوں۔ کچھ ایسا برا' گندا اور ناپاک بھی نہیں۔ کوئی خاص کم علمی بھی نہیں پھر میں سوچنے' جاننے اور محسوس کرنے کی آرزو بھی رکھتا ہوں لیکن میرے سارے خانے خالی ہیں کم از کم وہ سارے خانے ضرور خالی ہیں جو مفتی جیسے لوگوں کے بھرے ہوئے ہیں۔

بانو اپنے تینوں بیٹوں کو لمبے صوفے پر بٹھا کر اور خود نیچے قالین پر بیٹھ کر کہا کرتی "دیکھو بیٹا! ہم بڑوں جیسے تو نہیں بن سکتے۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے طے نہیں ہوا ہے۔ یہ ہماری برات نہیں ہے...... لیکن پیارے بیٹو ہم ان کے قریب ان کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک تو ضرور رہ سکتے ہیں۔ ان کی حد نگاہ میں تو ضرور آ سکتے ہیں۔ ان کے کارندے تو بن سکتے ہیں۔ اس لئے میرے پیارے بچو جب شہاب بھائی آئیں تو ان کے قریب قریب رہا کرو۔ گھر سے باہر نہ جایا کرو...... جایا کرو تو جلد لوٹ آیا کرو۔ بہت قریب نہ ہو سکو تو ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کی

کوشش تو کیا کرو۔ شہاب بھائی چنن رکھ ہیں۔ صندل کا پیڑ ہیں۔ ان کی چھاؤں بھی ہے اور
خوشبو بھی۔ یہ دوا بھی ہیں اور شفا بھی ہے...... اس کے ارد گرد رہا کرو۔ ان کی قربت سے فائدہ
اٹھایا کرو...... سنو پیارے بچو! اپنا وجود صندل کے وجود سے مس کرتے رہو۔

لکھ لکھ بدیاں سو سو طعنے سجھو سرتے سہئے وو
نال بجن دے رہیئے وو
تخن جنہاں داہووے دار و حال اتھائیں کیئے وو
چنن رکھ لگا وچ ویڑھے زور دکھانے کھہیئے وو
رہئے وو
کہے حسین فقیر سائیں دا جیوندیاں مر رہئے وو
نال بجن دے رہئے وو

اس کے تنے کو جپھا ڈال کر کھڑے رہو۔ کچھ نہیں کرنا۔ کچھ نہیں کہنا۔ کچھ نہیں
مانگنا۔ بس چنن رکھ کے ساتھ اور اس کے قریب رہنا ہے۔ اس کے ساتھ لگ کر زندگی بسر
کرنی ہے۔ خوشبوئیں خود بخود تمہاری ذات کا حصہ بن جائیں گی۔

بچے پوچھتے "امی ٹھیک کہتی ہیں ابو؟"۔

میں کہتا "بھائی مجھے کیا معلوم۔ تم جانو اور تمہاری ماں جانے ۔ لیکن اگر تمہیں اسی
قدر شک ہے تو پھر تم شہاب چچا کے آنے پر اتنا زیادہ گھر پر کیوں رہتے ہو۔ کیا تمہارے دوست
دوستیاں نہیں ہیں؟ کیا تمہیں پہلے کی طرح کام نہیں ہوتے۔ کیا تمہاری آشنائیوں کی ساری
روشنیاں گل ہو جاتی ہیں"۔ لیکن میرے خیال میں بچے باپوں کے مقابلے میں ماؤں سے زیادہ
متاثر ہوتے ہیں۔ جب ان کی ماں شہاب چچا کے آ جانے پر ان کے معصوم کانوں میں لوٹ
سیل!! "سستے سودے" "اچھے سودے" پھونکتی رہے اور بار بار
Profiteer اور Profiteer Capitalize Exploit
کہتی رہے تو اس کا بچوں کے دماغ پر اثر ہونا ہی ہوا...... میرے گھر میں سارے بچوں پر اور ان
کے دوستوں پر اور ان کے دوستوں کے دوستوں پر کچھ ایسا جادو جگا ہوا تھا کہ شہاب صاحب کے
آ جانے پر وہ سارے ان کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے اور اپنی اپنی مشکلات علیحدگی میں
یا سب کے سامنے "انکل شہاب" کو بتا کر ان سے رائے لیتے رہتے۔ ینگر جنریشن میں شہاب
صاحب سے زیادہ پاپولر "بابا" میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ مجھے پتہ تھا کہ چونکہ وہ نوجوانوں کی
ہر بات خندہ پیشانی سے سن لیتے ہیں اور کسی کو کسی بات پر سرزنش نہیں کرتے، جھڑکی نہیں

دیتے اس لئے پاپولر ہیں۔ لیکن جلد ہی نوجوانوں کے اس گروہ کے بعد ملازموں کے پھر
محلہ داروں کے اور بزرگوں کے اور خواتین کے اور نیم دانشوروں کے اور جمعدارنیوں کے گروہ
آنے شروع ہو گئے اور شہاب صاحب سے پتہ نہیں ان کو کون سی گیدڑ سنگی ملنے لگی کہ اس جم
غفیر میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ مجھے سب سے بڑی شرم اس بات پر آتی تھی کہ اگر میرے ہم عصر
ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ اشفاق صاحب کے گھر پر کیا ہو رہا ہے
تو وہ میرا باقی ماندہ بھی اپنی برادری سے نکال دیں گے۔ میں پہلے ہی دقیانوس، رجعت پسند،
جہل دوست اور گنوار نواز مشہور تھا۔ میرا کیا بنے گا!۔

میں نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ان بے یار و مددگار ضرورت مندوں اور بے نوا و
بے آسرا حاجت مندوں کا داخلہ اپنے گھر بین کر دیا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ تم کو جو کچھ
لینا ہے خدا سے لو۔ جو کچھ مانگنا ہے خدا سے مانگو۔ ایک فانی انسان سے رائے لیتے ہوئے اور اس
کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے اور ایک شخص کو اپنے سے برتر سمجھتے ہوئے تمہیں شرم آنی
چاہئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جیسے انسان تم ہو ویسے ہی انسان وہ ہیں۔ جس خدا کی تم مخلوق ہو
اسی خدا کی وہ مخلوق ہیں۔ جو صلاحیتیں خدا نے تم کو دی ہیں وہی ان کے پاس ہیں پھر تم اپنے
مسائل لے کر ان کے پاس کیوں آتے ہو اور اپنی مشکلوں کو ان سے کیوں بیان کرتے ہو!۔

میرے گھر سے بھیڑ تو چھٹ گئی لیکن میرا گھرانہ جس شبنمی پھوار میں برسوں سے لپٹا ہوا
تھا اس پر گرم لمحوں کی پیش قدمیاں شروع ہو گئیں اور ہم اپنی کمزور چھتوں کے نیچے کڑی
دھوپ کے کوڑے روڑے ہو کر رہ گئے۔

ممتاز مفتی نے زندگی کے ہر نئے توڑ پڑ یوں تو ہر شخص اور ہر شخصنی اور ہر صورت اور ہر
مورت سے پیار کیا ہے اور بعض اوقات اتنا زیادہ کیا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہماری جان بھی
ہمیشہ شکنجے میں جکڑی گئی ہے۔ ایک تو کلوخ اندازوں کی ہر وقت کی سنگ باری کہ ممتاز مفتی یہ کیا
کر رہا ہے دوسرے ممتاز مفتی کا ظالمانہ رویہ کہ ہم بھی اس کے محبوب سے اتنی ہی محبت کریں
جتنی وہ خود کرتا ہے۔ اس کے بھی اتنے ہی نخرے اٹھائیں جتنے وہ خود اٹھاتا ہے۔ اس کے اٹھنے
بیٹھنے پر ہم بھی کم از کم تین مرتبہ بسم اللہ کہیں...... ہم ممتاز سے ڈر کر یہ سب کچھ کرتے تو رہے
لیکن اس کی آئے دن کی محبتوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن جو عشق ممتاز مفتی کو شہاب کی
ذات سے ہوا اور بھری دنیا میں سب کے سامنے ہوا اور جو خود شہاب کے منہ در منہ ہوا اس کی
مثال شہاب کے چاہنے والوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں، نہ گھر والوں کے پاس نہ باہر
والوں کے۔ ہم نے کتابوں میں ایسے قصے ضرور پڑھے تھے لیکن اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے

نہیں دیکھا تھا۔ اس محبت کے سلسلے میں ممتاز مفتی نے ہم سے کوئی تقاضا نہیں کیا۔ اپنے
تعلقات سے ہماری مشکیں کس کر ہم کو زدوکوب نہیں کیا۔ ہمارے اوپر کوئی پابندی عائد نہیں
کی۔ صرف ہم نابیناؤں کی کورچشمی پر افسوس کیا کرتا تھا۔ ہم اس کے ہادی' اس کے مرشد کا
ادب کرتے تھے لیکن اس کو وہ نہیں سمجھتے تھے جو اس کے ذہن نے اور اس کی روح نے سمجھ رکھا
تھا۔ ایسا کیوں ہوا اور اس کی سمجھ بوجھ اور ذہانت ہمارے دیکھتے دیکھتے کیوں پلٹ گئی۔ یہ محبت
کا کوئی گہرا راز ہے جو میری گرفت میں نہیں آتا۔ یہ راز شاید انہی لوگوں کی آغوش میں آتا ہے
جو محبت والے لوگ ہوتے ہیں۔ جن کی روحیں محبت میں گندھی ہوتی ہیں اور جو محبت کرنے
کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ ممتاز مفتی بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے لیکن اس کی تباہ کن
اور خودشکن خرابی ایک ہی ہے کہ وہ بہت اونچی آواز میں محبت کرتا ہے۔ اتنی اونچی آواز میں کہ
محبوب خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتا ہے اور ہمسائے جا کر پرچہ کٹا دیتے ہیں کہ ہمارے پڑوس میں
اونچی آواز میں محبت لگائی جا رہی ہے۔

یحییٰ خان کے دور میں جتنے سال شہاب' عفت اور ثاقب ولایت رہے مفتی بظاہر پرسکون
اور باوقار اور پرباش رہا لیکن بباطن ماہی بے آب تھا۔ ان دنوں وہ نیش ضبط کے مزے لے رہا
تھا اور اس کے پاس سوائے ضبط کے اور کوئی متاع نہ تھی۔ وہ ہر وقت اسی بات کے انتظار میں
رہتا تھا کہ ایک نہ ایک روز دکھ دلدر کے یہ اندھیرے خودبخود دور ہو جائیں گے۔ سورج مغرب
سے طلوع ہو گا اور ہمارے تاریک صحن خانہ میں ہیشگی کی دھوپ آ جائے گی۔ "بس چن جی
دیکھتے جاؤ" مفتی کہتا۔ وہ آ جائے گا تو سب کام سدھ ہو جائیں گے۔ سارے رستے روشن ہو
جائیں گے۔ سب ایسے ٹھیک ہو جائے گا جیسے کارواں کے سفر میں پڑاؤ پر خیمے لگ کر شہر سا آباد
ہو جاتا ہے...... تم سمجھتے کیوں نہیں ہو اور محسوس کیوں نہیں کرتے ہو۔ تمہاری نظر اتنی کوتاہ
اور تمہارے اندیشے اتنے دراز کیوں ہیں"۔

یحییٰ خان کے زوال کے بعد شہاب صاحب جب لندن سے واپس پاکستان آئے تو گو ان
کو بہت سی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا لیکن ان کی صحت جسمانی کافی اچھی تھی۔ عفت البتہ کمزور
کمزور اور بیمار بیمار سی تھی۔ ہم عفت کو پہلے بھی اچھی طرح سے جانتے تھے لیکن اس کی بیماری
نے اور پھر لاہور میں بانو کی نگہداشت نے اسے اور بھی ہمارے قریب کر دیا۔ شہاب ہر ہفتے اپنی
بیوی کی خبر پوچھنے باقاعدگی کے ساتھ اسلام آباد سے لاہور آتے رہے اور بانو قدسیہ لالچی بلی کی
طرح اپنے بچے اٹھا اٹھا کر شہاب بھائی کے اردگرد بٹھاتی رہی کہ شاید اسی طرح وہ روباہی سے
شیری کی طرف مائل ہونے لگیں۔ کبھی کبھی مجھ سے بھی کہہ دیا کرتی کہ آپ بھی بچوں کے

ساتھ شہاب بھائی کے پاس بیٹھیں لیکن چونکہ میں اس کی طرح ضعیف الاعتقاد نہیں ہوں اس
لئے میں نے اس کی یہ خواہش کبھی بھی پوری نہ کی۔

لندن سے واپسی پر شہاب کے پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن کناروں پر اندر کو دھنس
گئے تھے اور اس In-growth سے اس کو بڑی تکلیف رہتی تھی۔ ولایت کے
Pedicurist پانچ پاؤنڈ لے کر اس کے انگوٹھوں کے ناخن کاٹ کر اور ان کے
کونے اوپر اٹھا کر نیچے بٹی ہوئی روئی کی پھریاں رکھ دیتے تھے۔ کوئی مہینہ بھر تو اس سے آرام رہتا
تھا لیکن ناخنوں کے پھر بڑھ جانے سے پھر وہی تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔ لاہور میں ہم نے باٹا
کی مال روڈ والی دکان سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ یہاں ایک "پیڈی کیورسٹ" ہے جو ناخن
بھی کاٹتا ہے' ان کی چونچیں گھسا کر گول بھی کر دیتا ہے۔ پاؤں کی چنڈیاں' ٹھیٹھیں اور
کارن بھی کاٹ دیتا ہے لیکن اس سے پیشگی اپائنٹمنٹ لینا پڑتی ہے۔ یہ کام میرے سپرد ہوا۔
ہر مہینے' سوا مہینے بعد میں اپائنٹمنٹ لیتا اور پھر شہاب صاحب کو اطلاع دے کر لاہور بلا لیتا۔
آپریشن کروانے کے لئے ہر بار مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا اور میں پیڈی کیورسٹ کی مہارت کو
دیکھ کر دل ہی دل میں اس کی داد دیا کرتا۔ اس کے پاس بہت سے ولایتی اوزار' پتھریاں' ریگ
مال' ریتیاں اور لوشن تھے جن کا استعمال وہ بڑی کشادہ دلی سے کرتا تھا۔ وہ کینیڈا کے کسی بیوٹی
کلینک کا ٹرینڈ پیڈی کیورسٹ تھا اور لاہور میں اپنا کلینک کھولنا چاہتا تھا۔ لاہور میں اس کے پاس
اتنا کام تھا کہ اگر وہ ایک کے بجائے چار کلینک کھول لیتا پھر بھی اس کی گاہکی ختم نہ ہوتی لیکن کسی
وجہ سے اس نے اپنا ذاتی کلینک نہ کھولا اور ایک روز جب میں اس سے اپائنٹمنٹ لینے گیا تو وہ باٹا
شوروم سے اپنا کاروبار چھوڑ کر جا چکا تھا اور اس کے احوال و آثار کسی کو بھی معلوم نہیں تھے۔

شہاب کے پاؤں کے ناخن بڑھ رہے تھے اور بل کھا کر اندر کو گھسے جا رہے تھے۔ ناخنوں
کی درلچسی کی وجہ سے پہلے اس نے بوٹ چھوڑ کر ہلکی کوہاٹی چپل پہنی۔ پھر ہوائی چپل پہن کر
دفتر جانے لگا۔ پھر صرف جرابیں پہن کر موٹر میں بیٹھ جاتا اور جرابیں پہنے پہنے لفٹ میں سوار ہو
کر اپنے دفتر کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ میں نے اسے فون کیا کہ فوراً لاہور آ جاؤ یہاں کوئی
بندوبست ہو جائے گا۔ میرا ارادہ اسے بوڑھ والے نائی کے پاس لے کر جانے کا تھا جو نہرنے کا
کام خوب جانتا تھا۔ وہ ہمارے ہوشیار پور کا نائی تھا۔ پاکستان بننے کے بعد پہلے ساہیوال کام
کرتا رہا پھر لاہور آ گیا۔ اس کا ہاتھ وسمہ لگانے' ناخن کاٹنے اور خط بنانے میں بڑا صاف تھا۔

جب شہاب لاہور آیا اور میں نے اس کی جرابیں کھلوا کر دیکھیں تو اس کے دونوں
انگوٹھوں کی حالت غیر تھی۔ پنجے سوجے ہوئے تھے انگلیاں موٹی ہو گئی تھیں اور چلتے وقت وہ

صرف ایڑیوں پر بوجھ ڈال کر چل سکتا تھا۔ میں نے اسے پلنگ کی پٹی پر بٹھایا۔ تکیہ فرش پر ڈال کر اس کی ایڑیوں کے نیچے رکھا اور اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں انگوٹھے آماس کی وجہ سے گرم ہو رہے تھے اور ان سے چنگیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے اس کے دونوں انگوٹھوں کو ایک ساتھ اپنی پولی سی چٹکی میں دبا کر دیکھا تو اس نے درد کے مارے دونوں پاؤں پیچھے کھینچ لئے۔ میں نے دونوں پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر پھر تکیہ پر رکھ لئے۔

میرے پاس اٹلی کے زمانے کا ایک ناخن گیر تھا جو پلاس کی طرز کا تھا اور جس کے اندر ایسا سپرنگ لگا ہوا تھا جیسے شاخیں کاٹنے والی قینچی کے اندر لگا ہوتا ہے۔ اس نیل کٹر کی چونچ کے ساتھ میں نے بڑی احتیاط سے اندر گئے ہوئے ناخن کا ایک کونہ کاٹا تو شہاب نے سانس چھوڑ کر کہا "واہ جی وا۔ ٹھنڈ پڑ گئی"۔ مریض سے ایسا حوصلہ افزا ریمارک سن کر میری ہمت میں اضافہ ہوا اور میں نے ناخن کے دوسرے کنارے کو بھی نیل کٹر کی چونچ میں پکڑ لیا تو تکلیف کی وجہ سے شہاب کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس نے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی۔ جب نیل کٹر نے تک کر کے یہ کونہ کاٹا تو اس نے اپنا پیر جلدی سے نیچے کھینچ لیا اور اس پر کافی سارا بوجھ ڈال کر بولا۔ "یہ پیر تو چلنے کے قابل ہو گیا۔ بالکل پرفیکٹ لیکن اب دوسرے کا کیا بنے گا"۔ میں نے کہا۔ "اتنا تو دوسرا بھی ہو جائے گا۔ آگے کا علم مجھے نہیں آتا" اس نے کہا "دیکھو میاں میں ذیابیطس کا مریض ہوں اگر خدانخواستہ پاؤں پر کٹ لگ گیا تو زخم مندمل نہ ہو سکے گا اور بات لمبی ہو جائے گی۔ اس لئے ذرا احتیاط سے کام لینا"۔

میں نے اللہ کا نام لے کر دوسرے انگوٹھے پر بھی اسی احتیاط اور اسی توجہ سے کام کیا تو ادھر بھی ٹھنڈ پڑ گئی۔ جب اس نے اپنے دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر قالین کے چاروں کناروں پر چل کر دیکھا تو اس کے چہرے پر وہی خوشی تھی جو پاؤں چلنے والے بچے کے چہرے پر اس روز ہوتی ہے جب وہ ڈگمگ ڈگمگ چلا تھا اور جس کے ماں باپ بھی فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا کر اس کے ساتھ ساتھ چلے تھے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تو نہیں چلا البتہ میری مڑتی ہوئی گردن اور گھومتی ہوئی نگاہیں قالین کے چاروں کناروں پر اس کے ساتھ ساتھ چلیں۔ جب وہ خوشی خوشی اپنا چکر کاٹ چکا تو میں نے اسے پکڑ کر پھر اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود ناخنوں پر تفصیلی آپریشن شروع کر دیا۔

مناسب اوزار نہ ہونے کی وجہ سے یہ آپریشن کوئی چالیس منٹ تک جاری رہا۔ جب میں اس کے ناخنوں کو فائل کر کے ان پر روغن زیتون لگا رہا تھا تو بانو قدسیہ اندر آ گئی۔ مجھے اس طرح فرش پر اور شہاب بھائی کو پلنگ پر بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر شہاب نے کھسیانے ہو کر

کہا "پیڈی کیورنگ ہو رہی ہے"۔

بانو نے آگے جھک کر دیکھا تو میں انگوٹھوں پر مالش ختم کر کے کتابت والی نب سے ناخن کا کونہ اٹھا کر اس کے نیچے روئی کی چھوٹی سی ڈگڈگی پھنسا رہا تھا۔ بانو میرے کمال فن کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بھیڑ گئی۔

اس کے بعد میں ہر جمعہ انار کلی میں پرانی کتاب بازاری سے ان رسالوں کو تلاش کرنے لگا جن میں ناخنوں کی حفاظت، انہیں کاٹنے انہیں سیدھا کرنے، انہیں تمیز سکھانے، راہ راست پر لانے اور بگڑے ہوؤں کا علاج کرنے کے طریق ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر مضامین عورتوں کے ناخن رکھنے، ناخن رنگنے اور ناخن بڑھانے کے ملتے تھے لیکن کبھی کبھی کسی رسالے سے میرے مطلب کا مضمون بھی مل جاتا تھا۔

پیڈی کیورنگ پر دو کتابچے میں نے ولایت سے منگوائے۔ ایک بہت بڑا البم متفرق مضامین کی کٹنگ کا ہو گیا۔ جن دواؤں اور لوشنوں کے استعمال کی تجاویز دی گئی تھیں وہ لوشن مقامی طور پر بنوا لئے۔ ایک ولایتی دوائی بھی مل گئی۔ اب معاملہ اوزاروں کی فراہمی کا تھا کیونکہ ہر مہینے ڈیڑھ مہینے بعد مجھے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

دوبئی میں میرا بھانجا جاوید طارق رہتا تھا۔ اس کو پیغام بھیجا کہ مجھے پاؤں کے ناخن کاٹنے کے وہ آلات ولایت سے منگوا کر دے جن کی تصویریں اس پیغام کے ساتھ بھجوائی جا رہی ہیں۔ اس نے مطلوبہ اوزار تو منگوا کر نہ دیئے دو اعلیٰ درجے کے "نیل کٹر" اور ایک سیٹ ناخنوں کی حفاظت کے آلات کا بھجوا دیا۔

پاؤں کے ناخن کاٹنے میں ہاتھ کی گرفت اور کہنی کے زاویہ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اوزار پر گرفت جس قدر مضبوط ہو گی کٹنگ اسی اعتماد کے ساتھ ہو گی کٹنگ صحیح ہو گی تو مریض کو تکلیف نہیں ہو گی۔ ہاتھ کے ذرا سے ہل جانے سے گوشت میں گھسے ہوئے کونے تباہی مچا دیتے ہیں اور ڈر اس بات کا ہوتا ہے کہ مریض درد سے پاؤں کھینچ کر اپنے آپ کو زخمی نہ کر لے۔ ہاتھ کی گرفت صحیح نہ ہو تو ناخن کو نرم کرنے والا لوشن کٹر کے منہ کو پھسلا بھی دیتا ہے۔ اس سے بھی حادثے کا خطرہ ہے۔ کہنی کا زاویہ ضرورت سے زیادہ اوپر ہو تو کٹر ناخن کو اوپر سے دباتا ہے اور بڑی شدید تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کہنی نیچی ہو تو کٹر کا نچلا پھل زیادہ اندر کو جاتا ہے اور اوپر کا چھلتا ہوا پھل گرفت چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے بھی کچے ماس کے زخمی ہونے کا اندیشہ رہتا ہے......

پاؤں کے ناخن کاٹنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ خاص طور پر کسی دوسرے کے کاٹنا......

جب میں نے دوسری مرتبہ شہاب کے ناخن کاٹے ان کو اچھی طرح سے ریتی لگا کر گولایا۔ ان پر سیولون ملے آلیو آئیل کی مالش کی اور دونوں پاؤں کو تیز سیلنگ فین کی ہوا میں تکیہ پر چھوڑ کر ہاتھ دھونے گیا تو بانو میرے پاس غسل خانے میں آئی اور کہنے لگی۔

"شہاب بھائی مجھے دنیا میں بہت زیادہ عزیز ہیں اور یہ بھی ساری دنیا میں صرف مجھی پر اپنی بھرپور شفقت کا اظہار فرماتے ہیں، لیکن یہ کچھ اچھا نہیں لگتا"۔

میں نے ہاتھ دھونے چھوڑ کر ٹونٹی بند کی۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور حیرانی سے پوچھا

"کیا اچھا نہیں لگتا"

اس نے رندھی آواز میں کہا "یہ سب کچھ۔ یہ جو آپ کرتے ہیں"

"کیا کرتا ہوں میں"

"یہ جو آپ شہاب بھائی کے ناخن کاٹتے ہیں۔ وہ بھی پیروں کے"

میں نے کہا "تو اس میں کیا ہے وہ میرا دوست ہے۔ جانی جان ہے۔ شدید تکلیف میں مبتلا ہے اگر میں اس کی تکلیف رفع نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا"۔

"تکلیف تو ٹھیک ہے" بانو نے کہا "لیکن آپ کا بھی تو معاشرے میں ایک مقام ہے دروازے چوڑ چپٹ کھلے ہوتے ہیں اگر آپ کے کوئی رشتہ دار آ جائیں۔ آپ کے بڑے بھائی صاحب...... یا میرے کنبے کے لوگ......

"تو پھر آ جائیں" میں نے خفگی سے کہا۔

"اگر کہیں سے ادیبوں کو پتہ چل جائے، صحافیوں کو، کالم نویسوں کو...... تو وہ ساری دنیا میں بدنام کر دیں گے"۔

"میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو وہ بدنام کر دیں گے"۔ میں نے ڈر کر کہا۔

"بگاڑنے کی بات نہیں ہے" بانو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا "وہ سب کو بتا دیں گے کہ اشفاق احمد فرش پر بیٹھ کر قدرت اللہ شہاب کے پاؤں کے ناخن کاٹتا ہے"۔

"تو اس میں جھوٹ کیا ہے" میں نے پوچھا۔

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ جھوٹ ہے" اس نے تنک کر کہا "جھوٹ نہیں ہے جبھی تو کہہ رہی ہوں۔ کیا آپ یہ کام بند نہیں کر سکتے؟"

"بند کیسے کر دوں بانو۔ اور کوئی ہے ہی نہیں جو یہ کام کر سکے......

میں نے بڑی محنت کے ساتھ یہ کام سیکھا ہے۔ کیا پتہ کل کسی اور کو اس کی ضرورت پڑ جائے"۔ جب وہ کچھ دیر اور ساکت و صامت کھڑی رہی تو میں نے کہا "بھئی اس میں برائی کی کیا بات ہے تم لوگ نہیں کیا کرتے اپنی دوستوں کے کام"۔

"اپنی دوستوں کے کام!" اس نے حیرانی سے پوچھا "کون سے کام؟" میں نے کہا "تم عورتیں ایک دوسری کے آگے بیٹھ کر سر میں تیل ڈلواتی ہو۔ کنگھی کراتی ہو۔ جوئیں نکلواتی ہو۔ اس وقت تمہاری بے عزتی نہیں ہوتی"۔

بانو نے کہا "وہ تو گاؤں میں ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے تو اس طرح سے نہیں کرتے ناں۔ ہم تو اپنے دوستوں کو برابر کی سطح پر ٹریٹ کرتے ہیں۔ ان کو تحفے دیتے ہیں۔ ان سے تحفے لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ گھومتے ہیں۔ پارٹیوں پر جاتے ہیں۔ ہوٹلنگ کرتے ہیں ان کی بیمار پرسی کرتے ہیں لیکن ان کی تیمارداری تو نہیں کرنے بیٹھ جاتے۔ کسی کی زچہ گیری تو نہیں کرتے۔ دوستوں رشتہ داروں کے پاؤں میں کدو تو نہیں جھسنے بیٹھ جاتے۔ اس کے لئے معاشرے نے الگ الگ شعبے قائم کئے ہیں۔ نرسیں ہیں، میٹرنٹی ہوم ہیں، بیوٹی پارلر ہیں، مساجرز ہیں، گیٹ ویل کارڈز ہیں، ویل فیر کی خصوصی تاریں ہیں"۔

میں نے کہا "مجھے ابھی تک دوستوں عزیزوں کو دبنا گھٹنا، ان کے ہاتھ دھلانا، سر جھسنا اچھا لگتا ہے"۔

بانو نے دردمندی سے کہا "آپ اس کام کو تھوڑی دیر تک روک نہیں سکتے"۔

"روک سکتا ہوں" میں نے کہا "لیکن کب تک"۔

"ہمارے بچوں کی شادیوں تک...... جب رشتے طے پا جائیں اور شادیاں ہو جائیں تو پھر شوق سے یہ کام شروع کر دینا"۔

ہم ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر بڑی دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ دلائل کے سلسلے میں بانو قدسیہ کا پلہ بھاری تھا اور میں تقریباً خاموش ہی تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں کسی کی خدمت کرنے یا کسی کی مدد کرنے سے منع نہیں کرتی۔ لیکن ہم ادیب لوگ ہیں۔ رائٹر ہیں۔ ہمارا کام لکھنا ہے، انفرادی مدد کرنا نہیں ہے...... ہمیں معاشرے کی اور حکومت کی اور Establishment کی خرابیوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ہمیں ایسے اداروں کے قیام کی تجاویز پیش کرنا ہے جو آڑے وقت میں لوگوں کی، مفلوک الحال اور دردمند لوگوں کی مدد کر سکیں۔ ہمیں اور سکول کھلوانے ہیں اور ہسپتال بنوانے ہیں۔ یہ نہیں کرنا کہ ہم خود محلے کے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جائیں۔ خود اپنے عزیزوں کے ناخن کاٹنے بیٹھ جائیں۔ خود ان کی مرہم پٹی کرنے لگ جائیں۔ ہمیں صرف ذہنوں میں انقلاب لانا ہے۔ نظریات میں تبدیلی پیدا کرنی ہے۔ خود لکڑہارے نہیں بن جانا۔ ہاتو!"۔

میں اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور وہ بڑی دردمندی سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں

اپنے گھر کے ماحول کو بھی بدلنا ہو گا اور اپنے ملک کو بھی ویل فیئر سٹیٹ بنانا ہو گا۔ ہمیں تعلیم کا 'صحت کا 'ملازمت کا' انشورنس کا' پیدائش کا' موت کا' کفن دفن کا سارا بوجھ معاشرے پر ڈالنا ہو گا اور کنبے کو گھرانے کو خاندان کو ایسی مصیبتوں سے نجات دلانا ہو گی۔ ہمیں یہ کنبہ سسٹم اور برادری سسٹم ختم کرنا ہو گا...... دیکھو ناں یہ ہمارا فرض تو نہیں کہ ہم کسی کے مڑے ہوئے ناخن کاٹتے پھریں۔ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر بڑے شہر میں پیڈی کیورنگ کلینک قائم کرے اور دکھی لوگوں کی مدد کرے۔

میں نے بانو کی یہ باتیں بڑے غور سے سنیں اور سب کو ایک ایک کر کے اپنے دل میں جگہ دی لیکن چونکہ میری بی۔ اے تک کی بیک گراؤنڈ بالکل دیہاتی ہے اس لئے میں بانو کی باتوں پر من و عن عمل نہ کر سکا اور ناخن کاٹتے وقت دروازے بند کر کے اور کنڈی چڑھا کر یہ عمل کرنے لگا۔

ایک روز شام کے وقت جب میں دروازہ بھیڑ کر شہاب کے ناخن کاٹ رہا تھا تو دھڑاک سے دروازہ کھلا اور بانو قدسیہ کی قیادت میں میرے بڑے بھائی 'میری بھابی 'ان کے دونوں بیٹے 'بیٹوں کی بیویاں اور ان کے ساتھ ان کے بچے ایک ہجوم کی شکل میں اندر داخل ہوئے۔ میں کنڈی لگانی بھول گیا تھا۔ شہاب نے کھسیانا سا ہاتھ اٹھا کر میرے بھائی سے مصافحہ کیا۔

میں نے نگاہیں اوپر اٹھائے بغیر اپنی بھابی سے کہا "اس کے ناخن اندر کو مڑ جاتے ہیں اور گوشت میں پیوست ہو کر خون نکال دیتے ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں ذرا ذرا اس کی مدد کر دیتا ہوں"۔ لیکن میرے ارد گرد پوری کٹ کھلی ہوئی تھی۔ اس میں ناخن کاٹنے والے اوزاروں کے علاوہ چھوٹی بڑی گول ریتیاں 'چوسے 'نہرنے 'لوشن 'کریمیں 'سیولون 'ڈیٹول آئنٹ منٹ کی ٹیوبیں 'محدث شیشے اور گھڑی ساز کا آنکھ کو لگا کر دیکھنے والا شیشہ بھی موجود تھا۔ بھائی جان کی ایک بھونے شرارت سے مسکرا کر کہا "چچا! یہ ذرا ذرا والی مدد ہے! اتنا سامان تو فنگ یانگ بیوٹی پارلر میں بھی نہیں ہوتا"۔

بانو نے کہا "ابھی دو چیزیں کم ہیں۔ وہ آ جائیں گی تو شہاب بھائی کو اور بھی آسانی ہو جائے گی۔ ابھی جب ہم کچھی پر ناخن کا کونہ اٹھاتے ہیں تو ان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو ذرا بھی تکلیف نہ ہو"۔

شہاب بہت مدہم 'بہت دھیمے 'بہت جھینپو آدمی تھے۔ چور سے بنے صوفے پر بیٹھے رہے۔ میرا سارا گھرانہ ان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑا رہا اور میں قالین پر پھیلی ہوئی چیزیں ایک

ایک کر کے کٹ میں ڈالتا رہا۔ بچوں نے انہیں ٹھڈے مار مار کر ان سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

دنیا کے بڑے کام اور بڑے فیصلے کچھ عجیب و غریب طریقے پر طے ہوتے ہیں۔ ان میں عقل و دانش 'فلسفے اور منطق' دلیل و برہان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ کوئی تجویز یا پلیننگ بھی نہیں ہوتی۔ جس طرح آج تک میں کسی حلقے 'کسی سلسلے یا کسی رابطے میں یا اپنے نقادوں اور نکتہ وروں کے سامنے کبھی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکا۔ نقادوں کے پوچھنے پر کہ فلاں کہانی کے فلاں کردار میں اچانک یہ تبدیلی کیوں رونما ہوئی۔ یا فلاں ڈرامے میں یہ انہونی بات کدھر سے آ گئی تو مجھ سے اس کا کوئی شافی جواب نہیں بن پڑتا۔ ممتاز مفتی اور بانو قدسیہ تو بہت ہی چھوٹے انسان ہیں۔ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں اچانک تبدیلی کیوں پیدا ہو گئی؟۔

یہ باتیں ہوئیں، ہو چکیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ میرے سامنے کی باتیں ہیں۔ آنکھوں دیکھی۔ مشاہدے سے گذری لیکن میرے پاس کوئی دلیل نہیں۔ کوئی جواز نہیں۔ کوئی وضاحت نہیں۔ کسی قسم کی جوابدہی نہیں۔ اگر میں سارے زمانے کی بولیاں بولوں اور سارے الفاظ پر قدرت رکھوں اور ساری جزئیات کا سالک ٹھہروں پھر بھی میں آپ کو الفاظ سے 'بیان سے 'حرکات و سکنات سے 'رقص سے 'پینٹنگ سے چائے کا ذائقہ نہیں بتلا سکتا۔ چائے کے رنگ سے اس کی خوشبو سے اس کی حدت سے آشنا نہیں کر سکتا۔ شاید یہ آپ کی مجبوری نہ ہو لیکن میرا عجز ضرور ہے کہ میں علم سے اور ابلاغ سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ اور ہی شے ہے جس سے نکلنے کا اور تدبیر کا حکم دیا گیا ہے۔

اب شہاب صاحب کے آنے پر بانو قدسیہ کی اولین فکر یہ ہوتی تھی کہ سب سے پہلے ان کے ناخن کاٹے جائیں پھر ان سے چائے کے لئے پوچھا جائے۔ وہ ان سے پوچھے بغیر میری کٹ اٹھا کر لاتی تو شہاب مسکرا کر کہتے "بانو ہر مرتبہ ناخن تراش کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ایک صحیح عمل ناخن تراش کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ ابھی میں آسانی سے چل لیتا ہوں 'سخت بوٹ پہن لیتا ہوں 'ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگلی مرتبہ سہی"۔ لیکن بانو میری جان عذاب میں ڈالے رکھتی کہ تم ایک مرتبہ ناخن دیکھ تو لو۔ ان کا معائنہ تو کر لو شاید کوئی کونا کنارا کاٹنے کے قابل ہی ہو۔ کہیں ریتی لگانے کی ضرورت ہی ہو اور شہاب بھائی تکلف سے کام لے رہے ہوں۔ وہ شرمیلے آدمی ہیں۔ زور دے کر نہیں کہیں گے۔ مجھے مجبوراً پاؤں کا ڈاکٹری معائنہ کرنا پڑتا اور پھر زبانی سرٹیفکیٹ جاری کرنا پڑتا کہ فی الحال ضرورت نہیں۔ پندرہ سے بیس دن کے اندر اندر آپریشن ضروری ہو جائے گا۔

معالج کے ہاتھوں میں مریض ایک عجیب طرح کا قیدی ہوتا ہے۔ وہ خود تو ممنون احسان ہوتا ہی ہے اس کے عزیز و اقارب' دوست' رشتہ دار' ملاقاتی اور لواحقین بھی معالج سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے گھگھیانے سے لگتے ہیں۔ میں بیٹھتا تو اس کے پاؤں میں تھا لیکن میری ہنرمندی کی بنا پر شہاب کا سارا خویش قبیلہ میرا شکر گزار تھا اور ان کے یہاں میرا قیام بالکل ایسا ہوتا جیسے نواب بھوپال کے یہاں حکیم اجمل خان کا ہوتا تھا۔

ایک روز اپنے بھانجے بھتیجوں کو میری خدمت میں مصروف پا کر اور اپنی ہمشیرہ کو میرے لئے خصوصی کافی بنا کر لاتے دیکھ کر اس نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں کہا "بڑی لمبی لمبی دوستیاں دور تک کم ہی چلا کرتی ہیں"۔

میں نے کہا "نہیں...... ضروری نہیں...... چل بھی جاتی ہیں"۔

اس نے اپنے قریبی حلقے میں سے دو جگری یاروں کا نام لے کر کہا "اب دیکھو ان کی دوستی بھی تو چالیس پنتالیس سال پرانی تھی"۔

"تھی' کا کیا مطلب" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تھی کا یہ مطلب" اس کی آنکھیں شرارت سے جگمگانے لگیں "کہ اب ان میں دوستی کا رشتہ باقی نہیں رہا اور انہوں نے ایک دوسرے سے بولنا بند کر دیا ہے"۔

"لیکن چند روز پہلے تو میں نے ایک ولیمے پر اکٹھے دیکھا تھا"۔

"اس میں تم تھوڑی سی صرف کی غلطی کر گئے ہو" شہاب نے لہرا کر کہا۔

"تمہارے اس فقرے میں اکٹھے کا لفظ بے جا استعمال ہوا ہے اور بیان میں ذرا سا سکتہ پڑ گیا ہے۔ وہ دونوں ولیمے پر موجود ضرور تھے لیکن اکٹھے نہیں تھے"۔

مین نے کہا "یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ہی میز پر بیٹھیں جوڑ کر ایک ہی انداز میں اونچی چوٹی والی بریانی کھا رہے تھے اور اونچے اونچے بول رہے تھے"۔

"آپس میں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "نہیں آپس میں تو نہیں دوسرے دوستوں سے بول رہے تھے جو سامنے کھڑے تھے"۔

"تمہیں ان کی گفتگو کا مضمون یاد ہے؟" شہاب نے پوچھا۔

میں نے کہا "کچھ بکھرے بکھرے سے مضمون تھے کچھ بہکی بہکی سی ہنکاریں تھیں۔ میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی"۔

"وہ جو بکھرے بکھرے سے مضمون تھے نا" شہاب نے کہا "وہ سامنے دوستوں کے

لئے نہیں تھے پیٹھ پیچھے کھڑے یار قدیم کے لئے طنز کے تازیانے تھے۔ اب وہ باقاعدگی سے ہر محفل میں جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو سب کے سامنے ضرب شلاق کرتے ہیں"۔

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور مجھے شہاب کی بات کا یقین نہ آیا۔ پھر اس نے میز کی دراز میں سے ان میں سے ایک دوست کا خط نکالا اور میری طرف پھینکتے ہوئے بولا "اس نے حال ہی میں سوفٹ کا فیتہ خریدا ہے"۔

"فیتہ؟" میں نے اور حیرت سے پوچھا۔

تو شہاب کہنے لگا "دوسرے دوست کو حال ہی میں سرکار کی طرف سے ایک پلاٹ ملا ہے اور وہ اس پر اپنی کوٹھی بنوا رہا ہے۔ آدھی رات کے وقت فیتے والا دوست اپنی کار میں بیٹھ کر اس کے پلاٹ پر پہنچتا ہے اور اس کے پلاٹ کو ناپتا ہے اور پھر بلبلا کر کہتا ہے۔ حرامزادے پٹھو کو ایک سو ساٹھ فٹ فرنٹ کا پلاٹ ملا ہے۔ کیوں نہ ملے دو دو ٹکے کے افسروں کی خوشامد جو کرتا رہا ہے۔ ان کی جوتیاں جو جھاڑتا رہا ہے اور ان کے بچوں کے منہ جو پونچھتا رہا ہے"۔ پھر وہ پلاٹ کے اندر اٹھتی ہوئی دیواروں کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی کا ماپ لیتا ہے اور گا گا کر کہتا ہے "باپ پھتو کمہار' بیٹا مغل شہسوار' ایک ایک فٹ کا سارا اسار۔ نوانچ کی نہیں کوئی دیوار' اور ایک آدھ گھنٹہ لگا کر' سارے Dimensions نوٹ بک میں لکھ کر واپس گھر چلا جاتا ہے"۔

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہے؟"۔

"مجھے چوکیدار نے بتایا ہے جو پلاٹ کی نگرانی پر مامور ہے"۔

میں نے کہا "کب گیا تھا فیتہ ٹیپ لے کر؟"۔

کہنے لگا "کب کیا بھائی۔ ہر رات جاتا ہے اور ہر رات ناپ لے کر آتا ہے۔ البتہ اپنے گانے میں مغلظات کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اب تو اس کی ہزلیات چوکیدار کو بھی یاد ہو گئی ہیں"۔

میرے لئے یہ ایک انوکھی اور ان ہونی بات تھی۔ اور مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اصل میں شہاب کا واقعہ تو ہمیشہ سچا ہوتا تھا لیکن اپنے بیان میں وہ مبالغہ آرائی ضرور کرتا تھا۔ تصویر تو ٹھیک ہوتی تھی لیکن وہ اسے فریم کئے بغیر آویزاں نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے ان دونوں دوستوں سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا بلکہ میں نے ان کی مثالی دوستی کو شہاب سے بھی زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی پچاس سالہ قدیم دوستی اس قدر گہری تھی کہ وہ اپنی کوئی بات' کوئی راز' حتیٰ کہ اپنا کوئی عضو بھی دوسرے سے پوشیدہ نہ رکھتے تھے۔ دوپہر کے وقت وہ

مادر زاد برہنہ ہو کر لنچ کھایا کرتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لباس پہننے سے انسان میں منافقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سچ سے اور حقیقت سے اور اخلاص سے دور ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ جون کی بھری دوپہر میں ریڈیو سٹیشن سے اٹھ کر میں بھی کسی کام سے ان کی طرف گیا تو ان کو لنچ کرتے دیکھا۔ میں نے تصویروں میں تو خوبصورت قسم کے کئی برہنہ وجود دیکھے تھے لیکن سچ مچ کے تھلتھلاتے نسواری رنگ کے بڈھے وجود اس طرح سے بھبھکا کے مارتے نہیں دیکھے تھے۔ میری گھبراہٹ پر وہ دونوں یک زبان ہو کر بولے "بیٹھ اوئے کھدر پوش منافق انسان، اپنے بدن اور اپنے عیبوں کو اور گناہوں کو چھپانے والے! بیٹھ اور روٹی کھا"۔ میں ان کے رعبِ حسن سے ایسا خوفزدہ ہوا کہ کرسی کھینچ کر لنچ میں شریک ہو گیا۔

خانساماں پھلکے پکا پکا کر لا رہا تھا اور بس آنا جانا ہی کر رہا تھا...... اس نے سر پر ایک چوخانہ رومال لپیٹ رکھا تھا جس کی ایک لمبی سی جھالر اس کی آنکھوں پر گری ہوئی تھی۔ وہ بس اندازے سے ہی میز تک پہنچتا تھا اور اندازے سے ہی روٹی رکھ کر واپس چلا جاتا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو انہوں نے جھلا کر کہا "یہ اس وقت کون منافق آ گیا!" میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو فیض صاحب کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ذرا سی تقویت ملی اور میں نے جلدی سے کہا "آ جائیے فیض صاحب آ جائیے...... دونوں حضرات تشریف رکھتے ہیں"۔

فیض صاحب کا گھر ریڈیو سٹیشن کے عین سامنے تھا۔ وہ بھی میری طرح تیز دھوپ میں پیدل چل کر آئے تھے اور ان کے تمتماتے ہوئے گالوں پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے پیچھے سے آنے والے کسی اور موٹے قطرے کے انتظار میں کھڑے تھے، انہوں نے داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص لہجے میں کہا "بھئی تم سے ایک مشورہ کرنا تھا کیونکہ ہم کو تو ان قانونی باریکیوں کی سمجھ نہیں ہے......" اور پھر جب دھوپ میں چندھیائی ہوئی آنکھیں کمرے کی روشنی سے مانوس ہوئیں تو فیض صاحب نے اونچی آواز میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا اور نعوذ باللہ، نعوذ باللہ کہتے ہوئے وہاں سے بھاگے۔

ان دونوں دوستوں نے مل کر زور کا نعرہ مارا اور کہا "بھاگ گیا ملّا بھاگ گیا مولانا...... اپنی عربی شریف ساتھ لے کر" مجھے بھی مجبوراً ان کے ساتھ مل کر ہنسنا پڑا کیونکہ وہ بار بار مجھے منافقت اتار دینے کو کہتے تھے اور میں بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اگلی مرتبہ آیا تو اتاروں گا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان دوستوں کے درمیان تفرقہ پڑ گیا ہے جن کو میں نے ایک

دوسرے کے قریب خود اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔

شہاب صاحب نے کہا "دیکھو بھائی میں نے یہ ساری تفصیل ایک ذاتی غرض مندی کے تحت فرام کی ہے۔ اور وہ ذاتی غرض یہ ہے کہ آگے چل کر جب ہمارے درمیان تفرقہ پیدا ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کے گھر ناپنا شروع کر دیں، اور ہماری دوستیاں دشمنیوں میں بدل جائیں تو تم میرے ناخن کاٹنا ترک نہ کرنا کیونکہ اس کام کا ماہر پاکستان میں اور کوئی ہے نہیں اور میں اس معذوری سے لاچار ہو کر چل پھر نہیں سکوں گا"۔

میں نے کہا "جب دوستی دشمنی میں اور رشتے داری شریکے میں تبدیل ہو جائے تو پھر میں یہ خدمت کیسے سرانجام دے سکتا ہوں"۔

"بالکل اسی طرح" شہاب نے یقین سے سر ہلا کر کہا "جس طرح ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ آپس میں سردھڑ کی بازی لگی ہوئی، ایک دوسرے پر چھ چھ مقدمے کئے ہوئے، لیکن پیشی بھگتنے کے لئے جانا ایک ہی یکے میں۔ کچہری میں روٹی ایک ہی ہوٹل سے کھانی اور کھانے کے پیسے بول کر کے دینے...... اس طرح سے ہم کر سکتے ہیں"۔

میں نے کہا "شہاب صاحب یہ ذرا مشکل کام ہے۔ میں مفتی صاحب کا تربیت یافتہ پٹھا ہوں اور ان کا اصول ہے کہ جب کسی سے توڑ دی تو پھر توڑ دی۔ دوبارہ تعلق پیدا نہیں کرنا۔ شاید میرے لئے یہ ناممکن ہو جائے کہ اصل میں تو ہماری بول چال بند ہے اور میں ناخن کاٹنے کے لئے باقاعدگی سے آپ کو مل رہا ہوں"۔

شہاب نے بڑی لجاجت آمیز لہجے میں کہا "میں یہ درخواست سنجیدگی سے کر رہا ہوں اور اس میں میرا خوف بھی شامل ہے۔ تم بس یہ سمجھو کہ مجھے گویا کینسر ہے اور اس کا علاج صرف تمہارے پاس ہے"۔

اس نے منہ بھر کے ایسی بیماری کا نام لے دیا کہ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے ان کا کندھا تھپتھپا کر بڑے مربیانہ انداز میں کہا "فکر نہ کرو۔ ویسے ہی ہو گا جیسے تم کہتے ہو"۔

افسوس کہ اس لمبی مدت کے درمیان وہ خوشگوار گھڑی ایک مرتبہ بھی نہ آئی جس کا مجھے انتظار تھا اور اس کو دھڑکا تھا...... اصل میں شہاب کا تعلق مجھ سے کم اور میرے بچوں سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ بچے جب ایک مرتبہ کسی کو دل سے مان لیں تو ان کو بدظن کرنا کافی مشکل ہو جاتا ہے۔

میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یہ تمنا کئی مرتبہ پیدا ہوئی کہ میرے اور شہاب کے درمیان

دشمنی کی گہری خلیج پیدا ہو گئی ہے...... میں نے اس کے خلاف خفیہ طور پر کئی خط اخباروں میں چھپوائے ہیں اور صحافی دوستوں سے مل کر اس کے خلاف کالم بھی لکھوائے ہیں۔ اس کے وہ خط بھی جید نقادوں کے حوالے کر دیئے جو اس نے مجھے لکھے تھے اور جن میں ایام جوانی کے فحش جملے بھی بار بار آتے تھے۔ اس نے بھی میرے منسٹر کو ایک ڈی۔ او لکھ کر مجھے نوکری سے نکلوانے کی کوشش کی۔ میری منسٹری سے کہا کہ ذرا اس بات کی تحقیق تو کریں کہ یہ شخص ہر حکومت میں بدستور اسی نوکری پر چلا آرہا ہے اور اس کی ملازمت ختم نہیں ہوتی ہے۔ اس اثناء میں مجھے اس کا پیغام ملتا ہے کہ "اب چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ کل لاہور آکر ناخن کٹوانے چاہتا ہوں۔ تم کہیں چلے نہ جانا"۔ میں جواب بھجواتا ہوں کہ کل نہ آنا۔ پرسوں آ جانا۔ کل مجھے ایک ضروری کام ہے۔ اور ضروری کام (جس کا میں اسے علم ہونے نہیں دیتا) یہ ہے کہ مجھے انکم ٹیکس والوں کو اس کے اس بنک اکاؤنٹ کا نمبر فراہم کرنا ہے جس کا اس نے اپنی انکم سٹیٹ منٹ میں آج تک ذکر ہی نہیں کیا۔

وقت مقررہ پر شہاب آتا ہے۔ میں انٹرکون کے کمرہ نمبر ۲۲۴ میں جا کر اپنے اوزار نکالتا ہوں۔ وہ سلام کرتا ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا۔ وہ پاؤں آگے پھیلا دیتا ہے۔ میں اسی توجہ اور اسی انہماک سے اس کے ناخن کاٹتا ہوں۔ وہ تھینک یو کہتا ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا۔ وہ مجھے لفٹ تک چھوڑنے آتا ہے۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ وہ کمرے میں واپس جا کر اپنے ناخنوں کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اچھا ایک آدمی کو الو بنایا ہے۔ میں دفتروں میں جا کر پرانے رجسٹر دیکھتا ہوں کہ مسمی قدرت اللہ شہاب کو کسی وقت کوئی "ٹوٹا اراضی" تو الاٹ نہیں ہوا۔

لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور شاید اس کی خواہش بھی بیچ ہی میں رہ گئی اور ہم دونوں کے خواب چکنا چور ہو گئے۔

ایک مرتبہ شام کے وقت شہاب صاحب نے اسلام آباد سے فون کر کے کہا "بانو! میرے ناخنوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ آسانی سے چل پھر نہیں سکتا۔ مسجد بھی نہیں جاتا۔ صرف جرابیں پہن کر بیٹھا رہتا ہوں۔ تم خلیفہ کو ایک دن کے لئے بھیج دو کہ آکر میرے ناخن کاٹ جائے"۔

میں رات کو دیر گئے گھر واپس آیا تو بانو قدسیہ ابھی جاگ رہی تھی۔ اس نے شاہد خان کو فون کر کے میرا اسلام آباد کا ٹکٹ بھی بنوا لیا تھا۔ میرا بیگ بھی تیار کر دیا تھا اور اثیر خان کے سرہانے الارم لگا کر گھڑی بھی رکھ دی تھی کہ صبح اٹھ کر مجھے ایئر پورٹ چھوڑ آئے۔

اگلی مرتبہ جب شہاب صاحب لاہور آئے تو بانو نے اپنے بچوں کو ان کے پاس کھڑا کر کے اور ان کے چہرے ان کی طرف اٹھوا کے کہا "شہاب بھائی! اس وقت ہم سب کے سامنے وہ اعلان کریں جو آپ نے اسلام آباد سے فون پر کیا تھا"۔

انہوں نے شرما کر سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئے۔ بانو نے دو تین مرتبہ بڑی بینتی کے ساتھ اصرار کیا تو انہوں نے کچھ پڑ کر بڑے دھیمے لہجے میں کہا "میں نے یہ کہا تھا اشفاق احمد میرا خلیفہ ہے۔ میرے خلیفہ کو ایک دن کے لئے میرے پاس بھیج دو"۔ پھر انہوں نے ذرا رک کر کہا

"میں اس کے لئے اور اس کے گھرانے کے لئے دعا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس گھرانے کو خیر کثیر عطا فرمائے"۔

بانو قدسیہ خوشی سے لبریز ہو کر سسکیاں بھر کر رونے لگی اور اس کے چہرے سے ساری کلفتیں اور ساری بیماریاں ایک ساتھ دور ہو گئیں۔

تئیس جولائی کو ان کی بھانجی گڈی نے فون پر مجھے اطلاع دی کہ "ماموں جی اچھی طرح سے چل پھر نہیں سکتے۔ آپ جلدی سے آجائیں"۔

میں اوزاروں کو اچھی طرح سے ابال کے اور پھر سیولون میں لتھڑ کر نئے لوشن بنانے لگا۔ شاہد خاں نے آکر بتایا کہ جہاز میں کوئی سیٹ نہیں ہے۔ ریکوئسٹ پر بھی اٹھارہواں نمبر ہے' اس لئے آپ گاڑی پر ہی جائیں اور صبح ہی صبح روانہ ہوں۔

میں صبح ہی صبح گاڑی پر نکل گیا تو اسلام آباد میں شہاب کے گھر کے گیٹ پر لوگوں کا بڑا مجمع تھا۔ لان پر ایک بڑا سا تنبو تنا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے۔ کچھ موٹروں سے نکل رہے تھے۔

گڈی نے آکر مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا "آؤ چچا آپ کو ماموں جی کے پاس لے چلوں۔ اپنے کمرے میں ہی ہیں اور لیٹے ہوئے ہیں۔

میں اپنے اوزاروں کی کٹ لے کر اس کے پاؤں کے پاس کھڑا تھا اور میرا اور اس کا معاہدہ تھا کہ جب ہم ایک دوسرے سے ناراض بھی ہو جائیں اور ہمارے درمیان تفرقہ بھی پیدا ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کے دشمن بھی بن جائیں' پھر بھی میں اس کا خلیفہ ہی رہوں گا اور اس کے ناخن اسی طرح سے کاٹتا رہوں گا جیسے اب تک کاٹتا آیا ہوں۔

میں نے اپنی کٹ اوپر اٹھا کر کہا "ناخن کٹوا لو"

لیکن وہ بولا نہیں

میں نے پھر کہا "ناخن نہیں کٹوانے تو کم از کم ان کے کونوں پہ ریتی ہی لگوالو"۔

لیکن اس نے میری اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا...... میں نے اپنے اوزار اس کے کمرے میں رکھ دیئے اور باہر آ کر شامیانے تلے بیٹھ گیا جہاں لوگ آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے۔

اس مضمون کو پڑھ کر آپ کو خود ہی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اشفاق کے دل میں شہاب بھائی کے لئے کیسی، کتنی اور کس طرز کی محبت تھی۔ لیکن میں آج تک ان دونوں کے رابطے کو سمجھ نہیں سکی۔

ایک جاننا مفتی جی کا ہوتا ہے کہ افہام وتفہیم کے بغیر رشتہ مضبوط نہیں ہوتا۔ ایک جان کاری خان صاحب کی ہے جیسے خوشبو کے تعاقب میں حسیات پر تکیہ کر کے آدمی محبوب کے حضور پہنچ جائے اور ایک میرا طریقہ ہے میں ہمدردی کا ہارپون مار کر گرفتار کرتی ہوں۔ سدرشن چکر چلاتی ہوں اور نرغے میں لے کر دوسرے کو جانتی ہوں۔ رات کے دس بجے جب انسان تھکا ہارا اور غمگین ہوتا ہے اس کے اعضا اپنے راز چھوڑنے لگتے ہیں چیتے کی طرح میرا حملہ ہوتا ہے۔ کسی کو جاننے کا میرا یہی نسخہ ہے کہ آپ اس کے راز جانیں۔ اس سے اتنی ہم نفسی کریں کہ نہ صرف وہ شخص آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائے بلکہ اس کی روح بھی آپ کے سامنے سینہ پیٹتی برہنہ ہو رہے۔ ایسے میں جس سے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کا اور میرا ایک معکوس رابطہ بن جاتا ہے۔ ہمدردی چاہنے والا میرے جال میں مکڑی کی طرح پھنس جاتا ہے۔ وہ مجھ پر اس قدر Dependent ہو جاتا ہے کہ اس کے شب و روز میرے بغیر کٹنے محال ہو جاتے ہیں۔ ہم صفیری چاہنے والے کی یہی معذوری، مجبوری میری روح کی غذا، میری مامتا کا چشمہ اور میری انا کی کھونٹی ہے۔

شہاب بھائی کو ہم مرکزی کی ضرورت نہ تھی وہ اپنی آزادی سے اتنی محبت کرتے تھے کہ پوڈل بننا ان کے لئے محال تھا۔ اسی لئے نہ وہ کسی کے راز معلوم کرتے...... نہ کسی کے راز اگلوا کر انہیں خوشی ہوتی۔ کوئی ان کے سامنے بیٹھ کر روتا رہے وہ بغیر وجہ معلوم کئے ہمدردی کئے جاتے وہ خط مماس کی طرح محض قطر پر رہ کر مدد کر سکتے تھے۔ انہیں کسی کی رسی پکڑنے، کسی کو دست نگر بنانے یا اپنے سے ہلکا ثابت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ سرکاری دفتروں میں جہاں جہاں وہ کسی کی مدد کر سکے انہوں نے لکھا کیو۔ یو شہاب اور مدد کر دی...... جب بھی کسی کو رقم کی ضرورت ہوئی انہوں نے منی آڈر پر لکھا کیو۔ یو شہاب اور رقم بھیج دی...... کسی کے مرگ ہو گئی تو وہ کیو۔ یو شہاب کو چھپا کر ساتھ لے گئے تا کہ مرنے والے کی ساکھ کم نہ ہو جائے۔ عیادت کو گئے تو کیو۔ یو شہاب کو گھر چھوڑ گئے تا کہ مریض کی سمع خراشی نہ کرے۔ شادی کے ہنگامے میں شامل ہوئے تو کسی کونے میں بیٹھ کر کسی انجانے شخص کے حوالے کیو۔ یو شہاب کو کر دیا مبادا اسے انٹرٹین کرنے کا بوجھ گھر والوں کے ذمے ہو جائے۔ دوستوں میں بیٹھے تو کیو۔ یو شہاب کو کھلا چھوڑ دیا تا کہ دوستوں کی ضیافت طبع کے لیے وہ اپنے سفروں کی داستان، نوکری کی روداد، بچپن کے واقعات

سنائے...... نوجوانوں کو کیو۔ یو شہاب نے کبھی خوفزدہ نہیں کیا۔ نوکر بھی اس بڑے صاحب سے ڈرے نہیں۔ نادار بیکس عورتوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کیو۔ یو شہاب ایک ایسا افسر ہے جس سے خوفزدہ ہونا چاہیئے۔

یہ سب اس لئے کہ خود آزاد رہ کر وہ کسی کی خود مختاری سلب نہیں کرتے تھے شہاب بھائی کسی کے دل میں سیڑھی اتار کر اترنا ہی نہ چاہتے تھے کیونکہ اترنے کے بعد قیام کرنے کی بھی ایک شرط ہوتی ہے اور وہ یہ شرط اس لئے پوری نہ کر سکتے تھے کیونکہ انہیں اپنی آزادی بہت پیاری تھی۔

چونکہ مجھے اپنی تکنیک سے شہاب بھائی سے واقفیت حاصل نہ ہو سکی اس لئے میں نے غور سے ان کی عادات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس میں کچھ مفتی جی کا اصرار بھی شامل تھا۔ وہ کہا کرتے۔

"میں شہاب بسر کرتا ہوں تم بھی کوشش کرو...... وہ کیا سوچتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کی نیت کیا ہے؟"

میں شہاب بسری تو نہ کر سکی لیکن میرا فوکس ان کی طرف ضرور ہو گیا۔

ویسے بھی شہاب بھائی سے ہمدردی کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے میں ان کو صرف دن کی روٹین کے حوالے سے جاننے لگی، صبح ناشتے کے وقت میں انہیں پراٹھا پکا کر دیتی۔ اور یہ معمول ان تک ہلکی پھلکی گفتگو اور چھوٹی سی رسائی کا باعث بنتا رہا۔

شہاب بھائی ایک مدت سے بہت ہلکا ناشتہ کرنے کے عادی تھے۔ لیکن میری طبیعت میں کھلانے پلانے کا اصرار بہت ہے۔ میں اپنے مہمان کو بے طور زچ کرنے کی عادی ہوں۔ شاید محفل میں نمایاں ہونے کی مجھے اس سے اچھی کوئی ترکیب نہیں آتی۔ کسی کو زیر بار کرنے کا اس سے مناسب طریقہ بھی مجھے نہیں آتا۔ اصرار ہی اصرار...... نمائش ہی نمائش۔ انا...... دکھلاوا ہی دکھلاوا انا ہی انا۔ کبھی بھونڈی شکل میں کبھی بڑے شائشتہ انداز میں...... لیکن ہمیشہ ہمدردی کے ہارپون کے ساتھ......

پہلی مرتبہ جب میں نے شہاب بھائی کے لئے پراٹھا پکایا...... اسے شہد اور ملائی کے ساتھ سامنے رکھا تو وہ ہولے سے کسمسائے، دونوں ہاتھ اٹھائے اور آہستہ سے بولے "یہ تو بہت زیادہ ہے......" لیکن جب میری مامتا کا جوار بھاٹا چڑھتا ہے تو معقول اور نامعقول دونوں کو بہالے جاتا ہے۔

میں نے تجاہل عارفانہ سے کہا...... "یہ زیادہ ہے جی؟...... میں ایک چھوٹا سا پکا دیتی ہوں......"

"ناں ناں...... بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ اور نہ پکائیں میں اور خان صاحب شیئر کر لیں گے"۔

لیکن میں کسی کو کب شیئر کرنے دیتی ہوں؟ اس طرح تو وہ توجہ بھی شیئر ہو جاتی ہے جس پر صرف میرا حق ہوتا ہے۔ میری انا صرف آدھے کوبرے کی طرح اٹھ نہیں سکتی۔

"نہیں شہاب بھائی...... ان کے لئے توے پر جو ہے......"

شہاب بھائی کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے تھے اگر وہ ٹھنڈا پانی مانگتے اور تین آدمی پانی کے بچ گلاس لے آتے تو وہ تینوں گلاس رکھ لیتے اور آہستہ آہستہ تینوں گلاسوں میں سے کچھ اس طرح پیتے کہ اگر خالی ہوتے تو

تینوں اور اگر بھرے رہتے تو تینوں ایک ہی سطح تک۔

پراٹھوں کا ناشتہ کرتے کرتے ایک دن انہوں نے کہا...... "ماں جی اور میں جب جھنگ میں تھے تو وہاں ہم نے ایک بھینس پال رکھی تھی۔ میں صبح پراٹھے کے ساتھ مکھن کھایا کرتا تھا...... رفتہ رفتہ میری گردن غائب ہو گئی' کندھے اور سر آپس میں جڑ گئے...... اور میں بالکل چورس نظر آنے لگا"۔

جب آخری مرتبہ وہ داستان سرائے آئے تو صبح کے وقت دوایوں کی گولیاں نیلی ڈبیا سے نکال کر کوارٹر پلیٹ پر رکھتے ہوئے انہوں نے کہا "بس یہ میں آخری مرتبہ آپ کے گھر کچھ پکا ہوا کھا رہا ہوں......"۔

میں نے چونک کر پراٹھا توے پر چھوڑ دیا اور خاں صاحب ازلی خاموشی کا شکار ہو گئے۔ "کیوں شہاب بھائی؟ کیوں؟؟......"

انہوں نے ہماری تشویش بھانپ کر کہا...... "نئیں بات کچھ خاص نہیں ہے جب پچاس کی عمر آ لگے تو ہر سال کوئی نہ کوئی مرغوب غذا چھوڑ دینی چاہئے۔ میں اب دوبارہ جب آیا تو کوئی پکی ہوئی چیز نہیں کھاؤں گا...... صرف پھل"۔

اس روز مجھے خوف لاگو ہوا کہ شاید...... شوربہ، سبزیاں' خشخاش' کھچڑی کھانے والا اب ہم میں نہیں رہے گا لیکن وہ اتنے انہماک سے لندن جانے کا پروگرام بناتے رہے کہ یہ ہلکا سا خوف بھی جلد جاتا رہا۔

شہاب بھائی کو پھل بہت پسند تھے۔ وہ چائے کی پیالی پینے سے پہلے خربوزہ' آم' سیب جو بھی موسم کا میوہ ہوتا کھانا پسند کرتے...... لیکن اگر پھل موجود نہ ہوتا تو نہ تقاضا کرتے نہ اس کے متعلق کوئی سوال کیا جاتا۔ ایک روز کہنے لگے ...... "جب میں نے نیا نیا آئی سی ایس پاس کیا اور لندن گیا تو وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ انگریز چائے پر پھل ضرور کھاتا ہے اس لئے میں نے پورا آئی سی ایس بننے کے لئے پھل کھانے کی عادت ڈال لی ہے......"۔

غالباً یہ ایک پردہ تھا...... جو وہ اپنے معمولات چھپانے کے لئے کیا کرتے۔ اللہ نے دنیاوی اور دینی نعمتوں کے دروازے ان پر کھول رکھے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اللہ جس کو چاہے نوازے، جس کو چاہے راندہ درگاہ کر دے...... سب کچھ توفیق سے ملتا ہے لیکن وہ اپنی عبدیت قائم رکھنے کے لئے بڑی کڑی مشقت کرتے۔ ساری ساری رات عبادات میں گزارنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ اسی لئے وہ پھل' ٹھنڈے مشروبات' یخ بستہ پانی' شکنجبین' بڑے شوق سے پیتے تھے۔ ان کے سارے جسم میں اللہ کے نام کی بھڑکی لگی ہوئی تھی اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ آہستہ چلتے' ٹھنڈی میٹھی گفتگو کرتے اور یخ پانی پیتے۔

شہاب بھائی ہر معاملے میں اعتدال کو پسند کرتے تھے...... کھانے پینے میں مسر کی دال کی کھچڑی' خشخشاش' سبزیاں' پھل شوق سے کھاتے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انہیں گوشت ناپسند تھا...... بلکہ یوں سمجھئے کہ جو کچھ ان کے سامنے لگا دیا وہی پسندیدہ ہو گیا۔ نمک زیادہ ہوا تو وہ بولے نہیں۔ کم ہوا تو انہوں نے مانگا نہیں۔ میں نے انہیں نمک دانی سے چھڑک کر کسی سالن پر نمک ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا۔ صرف ایک چیز میں وہ

اپنی پسند کا اصرار کیا کرتے تھے وہ بھی بہت لجاجت اور منت کے ساتھ کہتے...... "ٹھنڈا پانی......" اگر برف کوٹ کر بھی گلاس میں دے دی جاتی تو وہ اسے خوشی سے پیتے...... اور اگر پلانے والا نلکے کا پانی لے آتا تو وہ بھی آرام سے پی جاتے...... نہ کوئی شکایت کرتے نہ برف منگواتے۔ انہوں نے کبھی بھڑکیلے رنگ استعمال نہیں کئے۔ لیکن ایک ارغوانی مائل سرخ ڈریسنگ گاؤن ایسا بھی ان کے پاس تھا جسے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ پہن کر ہم سب میں بیٹھا کرتے۔ شہاب بھائی کی نوکری' زندگی اور نفاست پسندی کا تقاضا تھا کہ وہ خوش لباس رہتے۔ لیکن لباس کے متعلق انہوں نے کبھی تلاش اور گفتگو نہیں کی۔

مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اقبال سنٹیزی کے سلسلے میں کچھ تقریبات لاہور میں ہو رہی تھیں۔ انہی تقریبات میں شرکت کے لئے مرحوم اسکندر باؤ سانی بھی روم سے پاکستان آئے ہوئے تھے اور انشاجی بھی موجود تھے۔ ان تقریبات پر صبح صبح تیاری کا گرما گرم مرحلہ ہوتا۔ سب تیاری میں مصروف نظر آتے۔ شہاب بھائی اپنے کپڑے پولے پولے ہاتھوں سے اٹھائے باہر آتے اور بڑی انکساری سے کہتے...... "یہ ذرا کوٹ کے کالر کو پچھلی طرف سے استری کرا دیں تا کہ بہت زیادہ اکڑا ہوا محسوس نہ ہو......"۔

زیادہ کلف' جمی ہوئی استری والے کپڑے' ہینگروں میں ٹنگے ٹنگائے' ڈرائی کلینرز سے لوٹے ہوئے' کھڑکتے لفافے' خوشبو کے بھبھاکے اڑاتے' ایسے کپڑے جن سے تیاری' خود آرائی' اور خود پسندی کا گماں ہو کبھی ان کے ساتھ نہ ہوئے۔ وہ ایک انگریز صاحب کی طرح بڑا نفیس لباس پہنتے ان کے جوتے آرام دہ ہوتے ٹائیاں' جرابیں' رومال' دستانے قیمتی اور لباس کے مطابق نظر آتے لیکن ان چیزوں سے کوئی طمطراق ظاہر نہ ہوتی۔ کسی کو مرعوب کرنا' خود اپنی ذات کو نمایاں کرنا مقصود نہ ہوتا۔ دس بارہ سال پہلے انہوں نے شلوار قمیض پہننا شروع کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد صبح سیر کے بعد وہ کریب سول کے جوتے شرٹ اور پینٹ اتار دیتے اور سارا دن شلوار قمیض میں ہی بسر کرتے۔ لیکن نہ تو نفیس لباس وجہ عزت تھا۔ نہ شلوار قمیض کی سادگی سے مراد فقیری کا اظہار تھا۔ شہاب صاحب کی ذات کو کاغذ پر لانا اس لئے مشکل ہے کہ وہ کچھ بھی کسی کو دکھانے کی خاطر نہیں کرتے تھے۔ وہ مکمل طور پر اپنے اندر اپنی نیت کے تابع تھے اور وہ اس کمپس کو کسی صورت بھی غلط کرنے کو تیار نہ تھے...... کھانے پینے کی طرح کچھ لباس' کچھ رنگ' کچھ سٹائل انہیں بھی پسند تھے لیکن ان کی تلاش میں ان کے اصرار میں ان کی زندگی نہیں گزرتی تھی۔ پسند کا کپڑا ہاتھ آ گیا وہ پہن لیا...... ورنہ جو میسر آیا وہی پسندیدہ ہو گیا اتنی ٹریننگ کے باوجود عموماً وہ کہا کرتے............ "اس بار میں اپنا Conduct درست کر کے آؤں گا"۔

سردیوں کا موسم تھا۔ شہاب بھائی اپنا سرخی مائل میرون ڈریسنگ گاؤن پہنے بیٹھے تھے اور انہیں سردی لگ رہی تھی۔ اثیر خاں نے بھانپ کر کہا...... "شہاب چچا! میں اپنا سویٹر لا دوں؟"۔

"ہاں لا دو...... لیکن وہ تمہاری ایج پر زیادہ سوٹ کرنے والا نہ ہو......"

اثیر خاں ایک بجھا بجھا سا ہلکا نیلے رنگ کا سویٹر لے آئے۔ شہاب بھائی نے اسے آرام سے پہن لیا لیکن

سردی کم نہ ہوئی۔ "جیکٹ لاؤں جی؟...... "اشیر خاں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی سردی کچھ زیادہ ہے......"

اشیر خاں ایک سواتی گرم جیکٹ لے آئے جس پر براؤن ریشمی دھاگے کے بیل بوٹے بنے تھے۔ چونکہ یہ واحد اکلوتی جیکٹ تین بھائیوں کے درمیان تھی اور شہاب بھائی کو بھی علم تھا اس لئے انہوں نے ہلکے سے تامل کے بعد اسے بھی پہن لیا۔ اور بیل بوٹوں پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

اتنے میں انیق خاں بھی اپنی چادر لے کر آ گئے تو شہاب بھائی نے وہ بھی اوڑھ لی۔ غالباً اگر کوئی اور شخص اوور کوٹ، رضائی، کمبل، دھوتر، کھیس، جو کچھ بھی لاتا وہ قبول کرتے اور بغیر اعتراض کئے پہن لیتے...... وہ دوسرے کا مان بڑھانے کے لئے، اس کی اہمیت بنانے کے لئے چھوٹی چھوٹی فرمائشیں کرتے...... ورنہ نہ انہیں سویٹروں کی ضرورت تھی نہ چادروں کی...... وہ اندر کی حدت سے گرم ہوتے اور اندر کا ایئر کنڈیشنر ہی ان کی سردی کا باعث ہوتا۔

صبح کاذب سے پہلے کاسنی کمرے کے بند دروازے کی نچلی جھری سے ایک چھوٹی سی روشنی کی لکیر جھانکا کرتی۔ تہجد کے وقت ان کے غسل خانے کی کھڑکی سے روشنی کا ایک طاقچہ بغلی راستے کی دیوار پر پڑتا۔ لیکن نہ تو پانی کا شور سنائی دیتا نہ کسی اور قسم کی کھٹر پٹر سنائی دیتی۔ کچھ لوگ جب جاگ جاتے ہیں تو پھر انہیں دوسروں کی نیند سے مخاصمت پیدا ہو جاتی ہے، وہ اونچی اونچی اللہ کا نام لیتے ہیں۔ شپٹر شپٹر چلتے ہیں۔ ان کے منہ ہاتھ دھونے وضو کرنے سے پانی کے خوفناک چھپاکے سن کر بچے جاگ اٹھتے ہیں۔ مائیں بے آرام ہو جاتی تھیں۔ لیکن شہاب بھائی کی گھڑی کا الارم بھی کبھی کسی نے نہیں سنا...... مجھے ان کے ساتھ عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ شہاب بھائی، خاں صاحب اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور شہاب بھائی ہر رات تہجد گزارنے خانہ کعبہ جاتے تھے۔ رات کو وہ چوری چوری الارم لگاتے...... اور پتہ نہیں کس وقت اٹھ کر اور کیسی چابکدستی سے الارم بند کر دیتے کہ ہمیں سارے عمرے کے دوران ایک بار بھی جاگ نہیں آئی۔ وہ جانتے تھے کہ کمزور، دنیادار، اور طبعی طور پر کسلمندی کے مارے ہوؤں کے لئے الارم کی گھنٹی تادیب کا باعث تو نہ ہو گی البتہ شرمندگی کا موقع ضرور بہم پہنچائے گی...... ہم سوئے رہتے اور وہ فجر کی نماز کے بعد تھرموس میں چائے بھروا کے ہمارے لئے لے کر آتے اور پھر ہمیں جاگتے پا کر کہتے۔

"آج...... حرم شریف کے سامنے یوں ہوا...... کہ ایک بدو......"۔

شہاب بھائی کو معلوم تھا شہروں میں گھر پر رہنے والیاں ایک ہی ماحول میں رہنے کے باعث اوب جاتی ہیں۔ ان کا رابطہ بیرونی دنیا سے کم ہوتا ہے اسی لئے وہ گھر میں گھستے ہی مجھے، میری والدہ کو اور باقی جو بھی عورت گھر پر موجود ہوتی اسے اپنے تجربے میں شامل کر لیتے۔

شہاب بھائی اور خان صاحب ناشتے کے بعد دفتر چلے جاتے تھے دوپہر کا کھانا وہ بہت کم گھر کھاتے۔

مرکزی اردو بورڈ جو بعد میں اردو سائنس بورڈ ہو گیا، یہیں پر شہاب بھائی دوپہر کے وقت خان صاحب کے ساتھ سلاد اور روٹی کھاتے اور بڑی تعریف کرتے۔

"یار پاکستان میں یہ لنچ رائج ہونا چاہئے...... تھوڑا سا کچومر اور روٹی۔ لیکن اس میں ایک قباحت ہے...... یہ ہضم بہت جلد ہو جاتا ہے......"

عموماً شہاب بھائی اور خان صاحب عصر کی نماز سے کچھ پہلے گھر آتے۔ بڑے پھاٹک کو کھول کر جب وہ اندر داخل ہوتے تو بڑی دلچسپی سے گھر والوں کو اپنے گزارے ہوئے دن میں شامل کر لیتے...... "آج صبح اشفاق سے دو ایسے آدمی ملنے آئے جو Pain in the neck تھے اس کے لئے...... لیکن میرا وقت اچھا گزرا...... پھر میں نے خالد زبیری اور ہیڈی کو خط لکھا۔ دوپہر کو ہم دونوں بیڈن روڈ گئے اور ڈرائی فروٹ خریدا۔ لیکن اشفاق نے کاجو اور بادام زیادہ خود کھائے اور مجھے کم دیئے...... مونگ پھلی اس نے کم کھائی اور مجھے زیادہ کھلائی...... ابھی آنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے ہم لارنس باغ گئے تھے وہاں ہم نے کینو کھائے اور ایک ایسی عورت سے ملے جس نے اشفاق سے اپنے دوپٹے پر آٹوگراف لیئے۔ مجھے اس نے پہچانا نہیں ورنہ مجھ سے بھی ضرور آٹوگراف لیتی......"

عصر کی نماز اور چائے سے بہت پہلے وہ بڑی خوش دلی، ہلکے پھلکے مزاج سے سارے دن کی کارگزاری، ملاقاتیں، وقت کٹی کچھ اس طرح بیان کرتے کہ کبھی بھی لیفٹ آؤٹ ہونے کا احساس پیدا نہ ہوتا۔ جس طرح ٹیلی ویژن پر کرکٹ کا میچ دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کرکٹ کے ہر کھلاڑی کے ساتھ ہیں ایسے ہی شہاب بھائی دن بھر کی ڈائری کچھ یوں بیان کرتے کہ لگتا ہم بھی ان دونوں کے ساتھ رہے ہیں حالانکہ صبح ہی سے ہمارا پتہ کٹ چکا ہوتا۔

دراصل شہاب بھائی کے ساتھ کبھی بھی کوئی لیفٹ آؤٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب کوئی ملا، بڑی خاموشی سے ان کے ساتھ ہو لیا۔ کہانی کا وسط ہو تو شہاب بھائی پوری توجہ سے پچھلی بات بتا دیتے...... کھانے کا وسط ہو تو شہاب بھائی اپنی کھانے کی رفتاریوں کم کرتے کہ آنے والے کے ساتھ ہی کھانا ختم ہوتا۔ پتہ نہیں وہ کون سا طریقہ تھا کہ شہاب بھائی سب میں گھلے ملے بھی رہتے تھے اور سب سے الگ تھلگ بھی قائم۔ غالباً ان کا مقولہ تھا کہ "ہم پاس بھی سب کے رہے اور دور بھی سب سے"۔ بہت سارے سال عصر کے بعد ہلکی پھلکی چائے پیتے ہی شہاب بھائی اور خان صاحب باہر کسی نہ کسی سے ملنے چلے جاتے، واپسی پر کھانا کھاتے اور اس کے بعد شہاب بھائی اپنے کاسنی کمرے میں ریٹائر ہو جاتے...... شام کی ملاقاتوں کا معمول بہت بعد میں شروع ہوا...... شام گئے کی یہ ملاقاتیں عفت کی وجہ سے ہونے لگیں "عفت بہت بیمار ہے اور آج لاہور آ رہی ہے شاید وہ ہمارے ہاں قیام کرے تم اصرار نہ کرنا اس کی مرضی پر چھوڑ دینا......" خاں صاحب نے مجھے صرف اتنا کہا اور ڈرائیور کے ساتھ ایئرپورٹ روانہ کر دیا۔

جب سواریوں میں عفت اتری تو میں حیران رہ گئی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی مائل بہ فربہی عورت تھی۔ لیکن جو خاتون سیڑھیوں کی ریلنگ کا سہارا لے کر اتری اس کی ناک کا بانسہ بہت تیکھا اور اونچا، چہرہ ستا ہوا، جسم نوبالغ لڑکی

جیسا چھریرا، چال بڑھیا عورت کی طرح بے یقین، مسکراہٹ میں پشیمانی، ملال اور معذرت، آواز میں لجاجت اور آنکھوں میں میری پوری پہچان نہ تھی...... وہ میرے قریب آئی ہم بغلگیر ہوئیں تو مجھے پتہ چلا کہ عفت پہلے سانچے میں سے بہت تخفیف کر کے نکالی گئی ہے۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی لیکن اندر بیماری نے بہت توڑ پھوڑ مچادی تھی۔ جو کام شہاب بھائی اپنی خاموشی سے لیتے تھے ویسی ہی ایک ڈھال عفت نے اپنی مسکراہٹ کو بنا رکھا تھا۔ وہ لوگوں کو بوچھاڑ، زیادتی اور ناسمجھی کو اسی مسکراہٹ پر روکنے کی عادی تھی۔

"اے ہے...... آ گئیں" عفت نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

میری کوشش رہتی کہ میں عفت کے ساتھ خندہ پیشانی، خوش دلی اور ہنسی مذاق میں بھیگی ہوئی گفتگو کرتی رہوں۔ یہ تمام باتیں عفت کی فطری، طبعی اور ذاتی استعداد سے نکلتی تھیں اور میری فقط ڈرامہ تھیں۔ طبعاً میں بڑی نخس عورت ہوں۔ مجھ سے نہ ذہانت بھری گفتگو ہوتی ہے نہ پر لطف باتیں میری حصے میں آئی ہیں۔ لیکن بیماری نے عفت کا جو کچھ باقی ماندہ چھوڑا تھا اس وجود سے میں اس درجہ خوفزدہ ہوئی کہ میں نے عفت کی نقالی میں بولنے کا وہ انداز اپنا لیا جس سے ظاہر تھا کہ کچھ نہیں ہوا اور عفت بالکل تندرست ہے۔

عفت بلڈ یوریا کی مریض تھی اور اس کے گردے قریب قریب جواب دے چکے تھے لیکن وہ اپنے میاں کی سگی بیوی تھی۔ وہ توجہ اپنے آپ پر، اپنی بیماری پر، اپنی مشکلات پر نہ رکھنا چاہتی تھی اسی لئے اس نے میرا فوکس آنے جانے والوں پر پھبتیاں کس کر بدل دیا۔ ہم دونوں جب گھر پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ڈیڑھ فٹ اونچی برآمدے کی کرسی تک پہنچ نہیں سکتی۔ یہاں پھر عفت نے کسی مذاق میں مجھے مشغول کر لیا اور جب وہ میرے سہارے کامنی کمرے میں پہنچی تو مجھے بھول چکا تھا کہ وہ بیمار ہے......

یہ ۷۳ء کا واقعہ ہے کہ ۷۴ء کا...... یہ چند ماہ کی داستان ہے کہ ایک صدی کی...... لیکن جتنی دیر عفت میرے پاس رہی۔ میرے لئے بہار کا موسم، میلے کی خوشی، اور بچپن کا زمانہ رہا۔ مجھے اس کی بیماری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کسی خدمت کی میں اہل نہ تھی۔ شکایت اس کے ہونٹوں پر کبھی آئی نہیں اس لئے بیماری کا باب ہم دونوں میں بند رہا۔ جب بھی ہم اکٹھی ہوتیں عفت کی طبعی مزاح پسندی کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو رہتی۔ خشک، فلسفیانہ، زمانہ کشید گفتگو تب ہمیں راس نہ آتی تھی۔

اندر سے عفت قریب قریب مایوس ہو چکی تھی وہ لندن میں بڑی دیر علاج کروانے کے بعد لوٹی تھی اور اسے معلوم تھا کہ بیماری کی جس منزل میں وہ ہے وہاں ایلوپیتھک علاج کے پاس کوئی حل نہ تھا۔ اس لئے وہ کسی معجزے کی تلاش میں تھی کوئی ٹوٹکا، تعویز، وعدہ امید...... جو اس کے آخری ایام خوشگوار بنا دے۔

اسی سلسلے میں خان صاحب ہمیں بابا جی نور والے کے ڈیرے پر لے گئے...... خان صاحب میں ایک بڑی خوبی ہے۔ وہ صاحب کمال آدمیوں سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ایسا شخص چاہے جوتی گانٹھتا ہو، چاہے آئی سی ایس ہو وہ اس کی درگاہ پر جاتے ضرور ہیں۔ بابا جی نور والے دھرم پورہ میں رہتے تھے۔ ان کا ڈیرہ بکریوں، لوگوں،
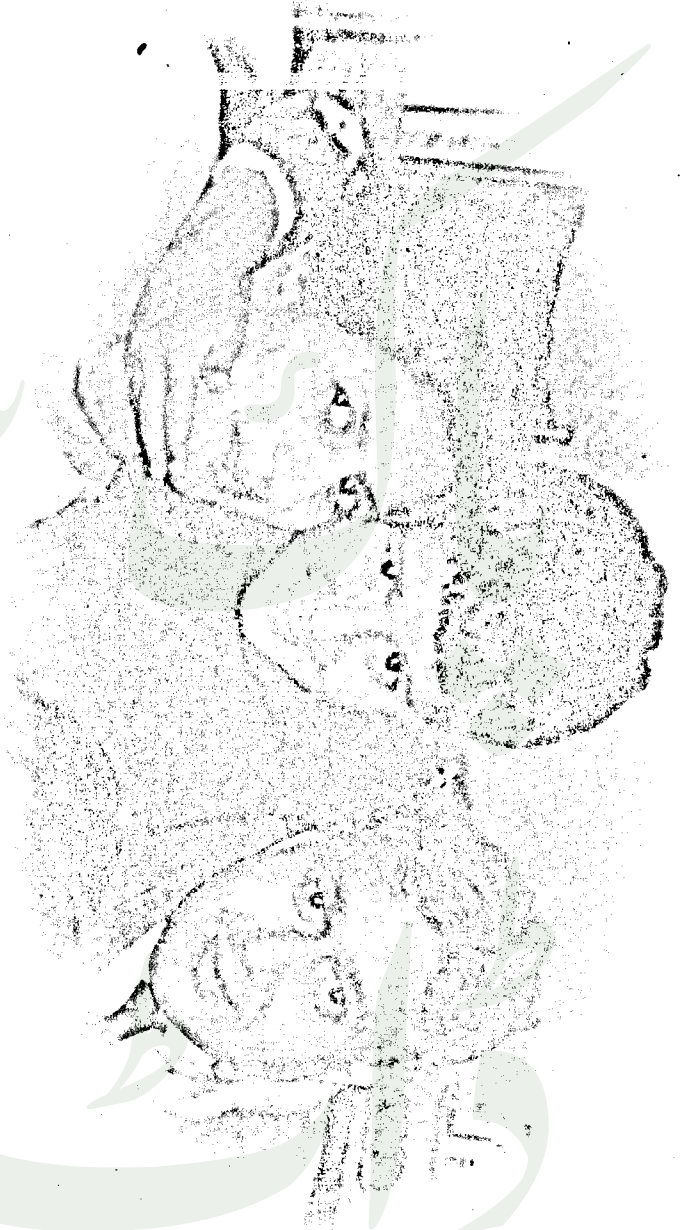
ان گنت چارپائیوں‘ بستروں‘ بھینسوں‘ مرغیوں‘ مریضوں‘ اور سبز پوش درویشوں کا ملغوبہ تھا۔ یہاں سے سب کچھ ہوتا چلا جاتا تھا پر کوئی تجویز نہ تھی۔ سب آنے جانے والے کھانا کھاتے پر آٹا ناپ تول سے نہ گوندھا جاتا۔ یہاں اشفاق صاحب مجھے اور بچوں کو کبھی کبھی لے کر جایا کرتے لیکن عفت کے آنے کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ ہم ڈیرہ پاک جاتے اور وہاں پہروں رہتے باباجی عفت کا علاج **بالغذا** کرتے...... عفت سارا دن میں دو مرتبہ دلیہ کھاتی اور انار کا رس پیتی۔ ان ہی ملاقاتوں کے دوران ایک روز باباجی نے فرمایا کہ۔ ”جمعرات کے روز ہم تم دونوں کو وضو کرائیں گے۔ تم دونوں کھری ہو اور تمہارا پاک کرنا ہمارا فرض ہے......“

میں ”پاک کرانے“ کی اصطلاح سے ناواقف تھی اور جی میں اس لئے خوش تھی کہ یہ بھی ضرور کوئی اعزاز ہو گا اس لئے حاصل کرنا چاہئے لیکن عفت واپسی پر گم سم تھی ”کیوں کیا ہوا ہے......؟“ میں نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں......“

”اگر کچھ نہیں تو یہ لمبا منہ کیوں بنایا ہے......“

”بھئی میں رات کو شہاب کو فون کروں گی۔ باباجی ہماری بیعت چاہتے ہیں“۔

مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پاک کرانا دراصل بیعت کے مترادف ہے۔ پھر بیعت تو خوشی کی بات تھی۔

”تو ہم بیعت کر لیں گے اس قدر پریشان کیوں ہو......“

”ہے نا پریشانی......“

شام عفت نے اسلام آباد فون کیا۔ پھر میرے پاس آئی اور کہنے لگی...... ”شہاب صاحب نے منع کر دیا ہے۔ ہم عورتیں ہیں۔ ہم کہاں باباجی کے تمام احکامات مان سکتی ہیں۔ کل کلاں وہ یہی کہہ دیں کہ بچے ڈیرے پر چھوڑ جاؤ تو کیا ہم ایسا کر سکتی ہیں۔ اگر وہ کہہ دیں سارا زیور ڈیرے پاک کی خیراتی تجوری میں ڈال دو تو کیا ہم ایسا کر لیں گی؟“

”تو پھر کیا ہوا؟ باباجی بہت ریزن ایبل آدمی ہیں۔ اول تو وہ ایسے احکامات دے ہی نہیں سکتے اور بالفرض دیئے بھی تو ہم جو بات لوجیکل ہو گی مان لیں گے باقی کے لئے معذرت کر لیں گے“۔

”بیعت بیعت ہوتی ہے کوئی نکاح نامہ نہیں ہوتا...... جو کچھ جی چاہا مان لیا جو نہ چاہا، شوہر سے انکاری ہو گئے“۔

مجھے نہ پاک ہونے سے کوئی سروکار تھا نہ بیعت کرنے کی بنیادی شرائط کا علم تھا۔ بہرکیف جو اہمیت ہم کو حاصل ہونا تھی وہ نہ ہو سکی اور جمعرات کے دن ہم ڈیرہ پاک نہ گئے۔ اس بات کا مدتوں مجھے رنج رہا۔

بہت سالوں بعد جب انیق خاں نے شہاب بھائی سے بیعت کرنا چاہی اور میں نے بہت اصرار کیا تو

شہاب بھائی بولے...... ”فی زمانہ بیعت بہت مشکل ہے۔ تعلیم اور ذہانت بہت بڑھ گئی ہے۔ مغربی اندازِ فکر نے ہم میں خود سوچنے کی صلاحیت بہت زیادہ پیدا کر دی ہے۔ اس لئے بیعت کرنے والا پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ بیعت کی یہ پہلی شرط ہے کہ سالک خیال میں بھی مرشد کی نافرمانی نہ کرے کیونکہ مرشد خیال میں فیض پہنچاتا ہے اور اگر سالک دل میں بھی نافرمانی کا مرتکب ہو جائے تو نقصان کا احتمال ہے......“

انیق خاں نے بیعت کا خیال چھوڑ دیا تو ایک مدت کے بعد شاہد خاں کی بیوی نسرین شہاب بھائی کے درپے ہو گئی۔ وہ شہاب بھائی کی بیعت کرنا چاہتی تھی۔ گورے چٹے‘ روایت پسند‘ اللہ کا خوف رکھنے والے شاہد خاں ایک ٹریول ایجنسی کے مالک ہیں۔ اور ان کی بیوی نسرین پرانی مشرقی عورت ہے۔ وہ خوبصورت ہے لیکن آگاہ نہیں کہ خوبصورت ہو کر انسان کیسے محسوس کرتا ہے۔ شادی شدہ ہے لیکن بیاہی عورت جیسی انا نہیں رکھتی۔ شاہد خاں سے دل کا تعلق تو رکھتی ہے لیکن زبان بند ہے۔ ایسی عورت جو تمام کیفیتوں کو اندر بند رکھنے کی عادی ہو، جب زندگی اس پر بوجھ ڈالتی ہے تو اسے ہادی‘ رہنما‘ مرشد کی بڑی ضرورت ہوتی ہے......

رات کا وقت تھا۔ میں بیمار تھی۔ کمرے میں فرش پر گدے ہی گدے تھے۔ آڑے ترچھے کسی پر کوئی لیٹا ہوا تھا‘ کسی پر کوئی کہنی کے بل نیم دراز تھا۔ شہاب بھائی کمرے میں موجود اکلوتے پلنگ پر خاں صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ نسرین‘ شاہد خاں اور ان کے تینوں بچے آئے۔ نسرین کا چہرہ ایسا تھا جیسے بن بلائے مہمان کا ہوتا ہے۔ بڑی دیر خاموشی کے بعد وہ بولی...... ”شہاب صاحب ایک بات ہے......“

شہاب بھائی نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ بہت سے ضروری اور غیر ضروری لوگ جمع تھے ”اکیلے میں بات کریں گی؟“

نسرین نے کچھ کن من کن من شاہد خاں سے کہا۔ وہ گردن تک سرخ ہو گیا۔

”کیا بات ہے......؟“

اب نسرین اور شاہد میں زیرِ لب مکالمہ چلا۔ پتہ نہیں اصرار کیا تھا؟ اور انکار کدھر سے تھا۔ بالآخر شہاب بھائی نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”یہ کہہ رہی ہے تم خود ہی کہہ لو نا“...... شاہد بولا۔

نسرین کسمسائی اور بولی...... ”آپ مجھے بیعت کر لیں......“

شہاب بھائی اتنے چپ ہو گئے کہ کمرہ جو مچھلی بازار کی طرح آوازوں سے گونج رہا تھا سکتے میں آ گیا پھر انہوں نے بڑی محبت سے کہا...... ”بیٹی بیعت تمہارے لئے ٹھیک نہیں...... ہاں آج سے تم مجھے اپنا

باپ سمجھ لو......"

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا...... بیعت کرتے تو جانے کیا کچھ کرنا پڑتا' ماننا پڑتا اب ایسی بابرکت شخصیت سے تعلق پیدا ہو گیا تو برکتوں کے امرکوٹ میں داخل ہو گئے اور آنند سے رہنے لگے...... کوئی مشکل مصیبت پڑتی تو شہاب بھائی کو پکڑ لیتے ورنہ آزاد کے آزاد۔ کیونکہ شہاب بھائی نے انہیں آزاد رکھنے میں ہی ان کی عافیت دیکھی تھی۔

اور یوں تو اختیار انہوں نے ہر اس شخص کو دے رکھا تھا جو ان کے قریب تھا۔ یہی آزادی عفت کو بھی ملی ہوئی تھی۔ وہ باباجی سے علاج کرانے کے لئے لاہور میں رہتی تھی۔ شہاب بھائی نے اس پر کوئی احکامات نہیں لگائے۔ وہ کہاں ٹھہرے گی؟ کیوں ٹھہرے گی' یہ طے نہیں کیا...... بس عفت میرے گھر رہ کر باباجی سے علاج کرانا چاہتی تھی یہ کافی تھا۔

ایک بار مجھے خیال آیا کہ جملہ شوہروں کی طرح یہ بھی شہاب بھائی کی غفلت ہی نہ ہو۔ جو شوہر بیوی کے ہونچے سے نہ بندھا ہو اس پر محبت کرنے کا احتمال نہیں ہوتا۔ عفت پرہیزی کھانا کھاتی تھی۔ دوپہر کو ڈیرے پر دلیہ کھاتی' رات کے لئے دلیہ ڈیرے سے ہی لے آتی اور یہی کھا پی کر پڑ رہتی۔ کئی مہینے وہ یہی خوراک کھاتی رہی اور کبھی شکایت نہ کی۔ لیکن ایک روز میں کڑاہی گوشت پکا رہی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی باورچی خانے میں آئی۔

"کیا پک رہا ہے؟" عفت بولی۔

"کڑاہی گوشت......"

"تجھے بھی ہر وہ چیز پکانا ہوتی ہے جو میں نہ کھا سکوں......"

"یہ تو تمہاری مرضی ہے عفت......"

"مرضی......" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... "وہ کیا ہوتی ہے؟"۔

"اب یہ تمہاری مرضی ہے ناں کہ شہاب بھائی اور ثاقب سے اتنی دور رہو۔ کڑاہی پکے اور تم صرف دلیہ کھاؤ......"

عفت بڑی بہادر تھی۔ لیکن اس لمحے وہ بہادر نہ رہی۔ کہنے لگی "میں شہاب اور ثاقب کو ٹرین کر رہی ہوں کہ جب میں نہ رہوں تو وہ میری کمی زیادہ محسوس نہ کریں......" یہ سارا گھرانہ ہی آفتاب ہے...... میں نے دل میں سوچا۔

اب شہاب بھائی' ثاقب' ولایت میں قیام' رشتہ دار' واقعات' ان گنت باتیں زیر بحث آئیں اور عفت نے اپنے گھر کی کھڑکی کے پردے کچھ یوں کھول دیئے کہ میں باہر سے ان اندر والوں کی زندگی دیکھنے لگی۔ کس طرح لندن میں شہاب بھائی لانڈری پر کپڑے دھونے جاتے تھے۔ پیسے کم ہوتے تو کتنا

ہی راستہ پیدل نکل جاتے۔ ان کے دل میں ثاقب اور عفت کے لئے کیسی پیاری قابل اعتماد محبت تھی۔ وہ اتنے گونگے ہونے کے باوجود عفت کو خطوں میں شعر لکھتے تھے......

اس محبت کا احساس مجھے تب اور بھی ہوا جب اچانک عفت کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ اس کی ناک اندر سے پک گئی تھی۔ ہولے ہولے گلے اور ناک سے لہو رسنے لگا تھا اور اسکے مٹی رنگے چہرے سے ساری خوش طبعی رخصت ہو چکی تھی۔

اس شام شہاب بھائی اسلام آباد سے آئے تو ان کے ساتھ ایک بڑا سا سوٹ کیس تھا۔ جس میں رنگ برنگی ساڑھیاں' سوٹ' سویٹر تھے۔ وہ یہ سارے کپڑے اس لئے لائے تھے کہ عفت ان کپڑوں کو پہننا پسند کرتی تھی۔ وہ عفت کو بہلانا چاہتے تھے۔ شام آ رہی تھی۔ نئے ارادوں کے ساتھ...... نئے فیصلوں کو لئے...... خدشات کو جنم دیتی...... امیدوں کو ختم کرتی۔

اس شام کے بندبورے میں بہت کچھ تھا...... شہاب بھائی تھے جو چپ چاپ کرسی میں نیچے سے ہوئے بیٹھے تھے۔ عفت تھی جو بار بار ناک تک رومال لے جاتی تھی...... ڈیرے پاک سے خربوزے کے بیجوں کی کھیر پک کر آئی تھی۔ ڈاکٹر اشرف فاضلی اصرار کر رہے تھے کہ اس کھیر کو کھانے سے افاقہ ہو گا۔ عفت میں کچھ بھی کھانے کا دم خم نہ تھا۔ وہ رحم طلب نظروں سے کبھی کبھی سب کو دیکھتی اور پھر کہتی...... "اشفاق صاحب آج تو بڑی تکلیف ہے......"

شہاب بھائی نیچی کرسی میں چپ بیٹھے تھے۔ عفت نے رنگدار لکیروں والی سیاہ سویٹر تلے اپنا انجر پنجر مجتمع کر رکھا تھا۔ بڑا اضطراب تھا...... شام میں...... موسم میں' شہاب بھائی کے دل میں...... لیکن نہ شام نے شور مچایا نہ شہاب بھائی نے کوئی دکھلاوا کیا اور دونوں عفت کا ہاتھ پکڑ کر میو ہسپتال چلے گئے......

شہاب بھائی اور میں کبھی کبھی عفت کو سوپ یا کوئی ہلکی پھلکی چیز دینے ہسپتال جایا کرتے تھے......

ایک روز گھر پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ شہاب صاحب کا بھتیجا' اس کے بچے...... ثریا شہاب اور اس کے بچے...... شہاب بھائی کے خاندان کے لوگ برآمدے میں آ جا رہے تھے اور وہ چپ چاپ ان سب کو دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک انہوں نے خان صاحب سے کہا...... "اشفاق یہ عفت کا پروار ہے...... ایسا پروار جس کی خوشیاں وہ نہیں دیکھ سکے گی......" اس وقت ثاقب بھاگتا ہوا کاسنی کمرے کے اندر گیا اور شہاب بھائی کے چہرے پر آنسوؤں نے دھاوا بول دیا...... وہ ایسے رونے لگے جیسے پہلے عشق کی وہ لڑکی روتی ہے جس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے طے ہو چکا ہو...... ان آنسوؤں میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ وہ انہیں پونچھتے تھے پر یہ بھادوں کی بارش کی طرح کھڑکیوں پر گر رہے تھے۔ شہاب بھائی کو علم تھا کہ عفت لندن سے لوٹ کر نہیں آئے گی۔

پھر میں نے سوپ کی تھرموس پکڑی اور کار میں بیٹھ گئی...... شہاب بھائی نے جیب سے رومال نکالا اور دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے...... ہوا چل رہی تھی۔ پتے درختوں کو چھوڑ رہے تھے ایک پتہ

ٹوٹ کر ونڈ سکرین کے وائپر سے آچپٹا تھا اور رہائی چاہتا تھا۔ مجھ سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر شہاب بھائی بیٹھے رو رہے تھے۔ جب کسی انسان کو میری ہمدردی کی ضرورت ہو تو میرا سارا وجود فعال ہو جاتا ہے۔ میری انا پھن اٹھا کر ڈسنے کے مقام کو دیکھتی ہے۔ مجھے ہمدردی کے کریٹ اتارتے دیر نہیں لگتی کیونکہ اسی رفاقت کے سہارے میرے ہاتھ میں ایک بہت بڑا سانٹا آ جاتا ہے۔ اپنی ذات پر دوسرے کی مکمل محتاجی...... اور پھر میں اس موٹی ناک کو جیسے چاہوں موڑ سکتی ہوں...... جدھر چاہوں چلا سکتی ہوں۔ لیکن اس وقت مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ میں بائیں طرف دیکھتی تمام ہمدردی کے جملے میرے اندر سوکھ گئے۔

یوں رونے والے شخص کی محرومی کو میں نہ دیکھ سکتی تھی نہ سن سکتی تھی۔ میری آنکھیں صرف ونڈ سکرین پر لگی تھیں اور میں سوچ رہی تھی اگر ہسپتال پہنچتے پہنچتے پتہ آزاد ہو گیا تو عفت بھی نہ رہے گی...... اور اگر ہوا کے باوجود پتہ اپنی جگہ قائم رہا تو عفت بھی ہم میں رہے گی...... پروار کی خوشی دیکھنے کو باقی رہے گی۔

جب کار ہسپتال پہنچی تو ونڈ سکرین کا پتہ ہلکی بوندا باندی سے بھیگ کر بونٹ پر دھرا تھا۔ نہ وہ ہمارے ساتھ تھا نہ اڑ کر کہیں گیا تھا...... ایسے ہی عفت ہم سے بچھڑ کر لندن چلی گئی۔ تب سے شہاب بھائی کے وصال تک نہ وہ اڑ کر کہیں گئی اور نہ ہی اس نے تنہا اداس شہاب بھائی کا ساتھ دیا!...... مسکرانے اور ہنسنے والوں کی غالباً یہی ادا ہوتی ہے نہ وہ ساتھ دیتے ہیں اور نہ راہ چھوڑتے ہیں۔ اس کے جانے کے کچھ عرصہ بعد لندن سے شہاب بھائی نے خان صاحب کو لکھا......

4 viners close
sitting bonne Kent
England.

۲۳ر دسمبر ۷۳ء

پیارے اشفاق اسلام علیکم

ہم یہاں پہنچے تو عفت کوما کی حالت میں تھی۔ چھٹے روز معجزہ رونما ہونا شروع ہوا اور اس نے آنکھ کھولی۔ اس کے بعد اس نے مجھے اور ثاقب کو پہچاننا شروع کیا اب اللہ کے فضل سے رفتہ رفتہ واپس آ رہی ہے لیکن ابھی کچھ عرصہ Intensive تھیریپی یونٹ میں رہے گی۔ پھر نارمل وارڈ میں۔ پھر انشاء اللہ گھر۔ امی سے دعا کرواتے رہیں۔

یہاں آنے سے پہلے ہمیں اندازہ تک نہ تھا کہ وہ کتنی بیمار ہے دس روز میں بارہ مرتبہ اس کا دل رک رک گیا۔ مشینوں کی مدد سے جاری رکھتے تھے۔

ایک نحیف جان پر اتنی سختی توبہ توبہ۔

تمہارا

قدرت

ہم پر امید ہو گئے مجھے محسوس ہونے لگا کہ عفت بچ جائے گی۔ پھر جولائی میں یہ خط آ گیا۔

جولائی...... ۷۴ء

پیارے اشفاق

عفت تو چلی گئی۔ اس کے لئے اچھا ہوا ہو یہ تو اللہ جانتا ہے۔ لیکن جب آب زمزم سے غسل دے کر ہم نے اسے کفنایا تو تنویر جو جرمنی سے آیا تھا رو کر کہنے لگا کہ یہ تو ایسے لگتی ہے جیسے ابھی فسٹ ایئر میں داخلہ لینے چلی ہو...... اٹھارہ سال پہلے جب میں اسے بیاہ کر لایا تھا اس سے بھی کم عمر، ہشاش بشاش اور پرسکوں لگ رہی تھی۔ ثاقب نے اسے دیکھا، مسکرایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "امی کتنے آرام میں ہے" لیکن جب اسے قبر میں اتارا اور مٹی نے اس کے تابوت کو ہماری نظر سے پوشیدہ کر لیا تو ہم دونوں معاً گھاس پر بیٹھ گئے۔ اب ہم آپس میں اس کی کوئی بات نہیں کرتے۔ الگ الگ چپکے چپکے رو لیتے ہوں گے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہماری زندگی میں اتنا بڑا خلاء پیدا کر جائے گی...... میں بے حد ڈانواڈول ہوں۔ تخلیہ میں رو کر اندر کی آگ اور بھی بھڑک اٹھتی ہے ثاقب اور میں نے باہم فیصلہ کر لیا ہے کہ اب واپس گھر چلیں۔ عفت کا سامان پچھلے ہفتے لیورپول کی بندرگاہ پر پہنچا ہے ہم اسے وصول کئے بغیر واپس پاکستان بھیج رہے ہیں

بانو اور بچوں کو پیار

تمہارا

قدرت

عفت کے رخصت ہونے کے بعد یک دم خان صاحب کا رویہ شہاب بھائی کے ساتھ بدل گیا۔ خان میں ایک بڑی خرابی ہے وہ اپنے پروگرام، اپنے ارادے، اپنی پرائیویٹ ذاتی زندگی کسی دوسرے ذی روح کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتے۔ اگر وہ کسی کی مدد کریں اور بات نکل جائے تو انہیں رنج ہو گا۔ اگر وہ کسی سے پریم کریں اور افشائے راز ہو تو بھی وہ محجوب ہو کر رہ جائیں گے...... ان کی ڈاک میں سے اگر کوئی اور نگی کا رسالہ کھول لے یو ایس آئی ایس کے سائیکلو سٹائیل لمبے لفافے یا ایمبیسی کا اخبار اگر انہیں دوسرے ہاتھ کھلا ملے تو ان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ خان سالگرہ کی تقریب، مہندی کی رسم، اچھل اچھل کر بغلگیریاں، قسمیں کھا کھا کر وعدے، اونچے اونچے مبارک بادیاں، ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظیں، دوپٹہ بدل سہیلیاں، واضح طور پر سجے ہوئے گھر اور بھڑکیلی عورتیں ناپسند کرتے ہیں...... خاں صاحب کو نفیس سینٹ، چھپ چھپا کر بہت زیادہ سجاوٹ کرنے والی عورتیں، بغیر شکریہ

تحفے وصول کرنے والے لوگ، ذہانت کو چھپا کر بات کرنے والا شخص، سادہ لباس، سادہ خوراک، بغیر تصنع کے سجے سجائے گھر میں رہنے والے پرکار باسی پسند ہیں...... خان کے ساتھ ایک عرصہ رہنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ افشائے راز کی زندگی دراصل ان کے Genes سے آئی ہے۔ جب ان کے آباؤ اجداد پتھریلے سنگلاخ پہاڑوں میں رہتے ہوں گے اور دوستی ناپائیدار اور دشمنی لازوال ہوگی، تب ماؤں نے بچوں کو غیرت کا انمول تعویز لہو کے ساتھ دیا ہوگا...... یہی بڑھی ہوئی غیرت جو پٹھان کے تحفظ کا اکلوتا نسخہ ہے خان کے لہو میں بمقدار وافر موجود ہے۔ وہ سیاست، کلچر، اسلام، تعلیم اور ایسے تمام موضوع جو ان کی ذات کے مرکز کو نہ چھوئیں بڑی آسانی سے زیر بحث لا سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو اپنی ذات کا سراغ دے کر وہ زندگی کا سب سے بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس طرح اشفاق احمد غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔
ان کی الماری میں دو چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے ٹرے ہیں اور اسی الماری کے اور تین خانے بھی خاں کی تحویل میں ہیں۔ کیمرے، ٹیپ ریکارڈ، بیٹریاں، پرانے سیل، **مائیکروفون** وغیرہ کے علاوہ ان دو زرد رنگ کی فوٹوگرافک ٹریز میں پی۔ آئی۔ اے کے پرانے ٹکٹ، ایسے لنز جن سے نہ کچھ دور کا نظر آتا ہے نہ قریب کا، کتھا لگی سپاریاں، سپرنگ، کامن پنیں، باسی پان، ایسے سکے جو متروک ہو چکے ہیں، پرانی عینک جس کا نمبر لاگو نہیں، خشک انک پاٹ، نہ چلنے والے مارکر، فروخت شدہ فوکسی، سکوٹر اور سائیکلوں کی چابیاں، ایسے وزٹنگ کارڈ جن کے مالکوں سے ملنے کا انہوں نے کبھی ارادہ کیا ہوگا، مفتی جی کی دی ہوئی ہومیوپیتھی کی پڑیاں، انیس خاں کے خط، خانہ کعبہ کے گرد سے چنی ہوئی کنکریاں، کسی کا پھولدار رومال، معجون کی ڈبیا، چورن کی پھنکی، فیوز بلب......

یہاں اس الماری میں ایک کائنات آباد ہے...... گرد سے ڈھکی ہوئی، نظروں سے اوجھل، خاں کی سیکرٹ لائف کے کئی ورق یہاں موجود ہیں جنہیں شاید کوئی باہر کا شخص تو انٹرپرٹ نہیں کر سکتا لیکن خاں صاحب ایک ہی نظر میں کبھی گریزبل ہوتے ہیں کبھی جھیل **سیف الملوک** پر...... کبھی وہ او سلو دیکھ سکتے ہیں...... اور کبھی شنگھائی۔ ان کی یادوں کی بارات کے یہ سٹیشن کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اسی لئے جب کبھی میں ان کی الماری صاف کرنا چاہتی ہوں وہ بچے کی طرح بلک کر کہتے ہیں...... "سارا گھر تمہارے جھاڑن کا منتظر ہے اس کونے کو اگر رہنے دو تو کونسی قیامت آجائے گی"۔

اپنی ذات کو چھپا کر رکھنے والے خان صاحب عفت کے جانے کے بعد اپنے اندر کے جذبات زیادہ چھپا نہ سکے۔ اب وہ موقعہ بے موقعہ اسلام آباد جانے لگے۔ کبھی کبھی ہفتے میں دو بار بھی اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوتا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہہ بیٹھتا کہ آپ شہاب بھائی سے ملنے جا رہے ہیں تو پھر افشائے راز ہوتے ہی خان کو غصہ آجاتا۔ ہر سفر سرکاری میٹنگ کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ چاہے اس کی ٹکٹ وہ پلے سے خریدتے...... ہمیشہ وہ شہاب بھائی کے گھر ٹھہرتے بھانویں انتظام ہوٹل میں ہوتا۔

شہاب بھائی بھی خاں صاحب کی طرح افشائے راز سے بدکتے تھے۔ ان کی زندگی بھی برسوں گپت ہی چلی آرہی تھی۔ لیکن عفت کے جانے کے بعد پتہ نہیں وہ کون سا راز تھا جس کی طرف ان کی توجہ ہو گئی کہ انہوں نے اپنی زندگی، اپنا گھر، اپنا کمرہ، اپنی نمازیں، اپنی بزرگی آہستہ آہستہ سب کچھ لوگوں کے حوالے کرنا شروع کر دیا۔ اب نہ زندگی کو راز رکھنے میں انہیں کوئی دلچسپی تھی نہ اللہ کا بندہ کہلانے میں کوئی عار تھا...... ان کے راز عفت کے جاتے ہی بدل گئے تھے۔ اب انہوں نے ٹین، اخبار، پرانی بوتلیں، ٹوٹا فرنیچر، بوسیدہ قالین سب سرعام ڈال دیئے تھے اور ایک کوہ نور ہیرا دل میں چھپا لیا تھا جس کی ایک جھلک بھی کسی کو دکھائے بغیر وہ حسن خاتمہ تک پہنچ گئے۔ خاں صاحب کی الماری میں ٹھونسا ٹھونس ضروری غیر ضروری سامان پڑا رہتا ہے اس لئے کہ یہ کثافت ان کی روح کی لطافت کے لئے ضروری ہے۔ شہاب بھائی کے کمرے کا سامان بے ربط اس لئے دھرا رہ گیا کہ اس کا مالک کوئی نہ تھا جو ان کو باربط کر سکتا...... اس کو دھرنے سنوارنے والی تو بہت پہلے رخصت ہو چکی تھی اور گھر والی کے بغیر گھر کے سامان کی شہاب بھائی کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔

شہاب بھائی کے کمرے میں دروازے کے آگے ایسا سائیڈ بورڈ تھا جس پر کتابیں اینٹوں کی طرح لدی تھیں۔ ساتھ ہی وہ صوفہ تھا جس پر ہلکے فیروزی رنگ کا کپڑا چڑھا تھا۔ دو پلنگ، ایک الماری، ڈریسنگ ٹیبل، جس کا سفید فارمائیکا سنگ مرمر سے بھی زیادہ ملائم تھا۔ اس کے علاوہ تین چار چھوٹی میزیں، کچھ گاؤ تکئے، کچھ گدیاں، ان گنت کتابیں، جوتیاں، ہیٹر موجود تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سینٹ کی بھری بوتلوں کے ساتھ خالی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ اندر بغلی کمرے میں ان گنت سوٹ کیس، یخ دان، بغچے، الماری، اٹیچی، بیگ موجود تھے...... یہ سامان برسوں ایسے ہی رہا۔ جیسے وہ منظر بدلنا نہ چاہتے تھے۔ عفت جس چاؤ سے فرنیچر ہالینڈ سے بنوا کر لائی تھی اس فرنیچر کو ویسے کا ویسا بلا ضرورت رہنے دینا ہی ان کے لئے کافی تھا۔ سوٹ کیسوں میں عفت کے کپڑے بوسیدہ اور پرانے ہو رہے تھے لیکن شہاب بھائی میں ہمت نہ تھی کہ ان کو نکال کر بانٹیں یا استعمال میں لائیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ عفت سے کچھ ایسی دیوانہ وار محبت کرتے تھے کہ اس کا سامان بانٹ کر انہیں دکھ ہوتا بلکہ انہوں نے اندر ایسا سکون تلاش کر لیا تھا جو تبدیلیوں کا متحمل نہیں ہوتا۔ اللہ کی محبت کا جو کوہ نور انہیں اندر مل گیا تھا، اس کا یہی تقاضا تھا کہ باہر کے ماحول میں کم سے کم ہلچل پیدا ہو۔ اسی اکلوتے راز کے تحفظ کے لئے وہ اپنی بہن محمودہ کے پاس رہنے لگے اور حسن خاتمہ سے بہت پہلے اپنی ساری املاک کا مالک انہوں نے ثاقب کو کر دیا۔ خان پرانی بیکار چیزوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے کیونکہ وہ ابھی ان لمحات میں گرفتار تھے جب یہ اشیاء ان کے ہاتھ آئی تھیں۔ شہاب بھائی کے لئے سب بیکار ہو گیا تھا۔ فرنیچر، کتابیں، قلم، قلمدان، گلدان، تصویریں، جوتے، ہیٹر، قالین، چیزوں کے چھوٹے چھوٹے بے معنی انبار، شہاب بھائی ان سب

سے گزر گئے تھے جیسے بچہ لڑکپن سے نکل کر جوان ہوتا ہے اور پلٹ کر پھر کبھی چھوٹے بیٹ سے کرکٹ نہیں کھیلتا شہاب بھائی کے لئے تمام انفریشن' ساری اشیاء' ہر قسم کی ملکیت بے معنی ہو کر بیکار پڑی تھیں۔ رکھنا اور پھینک دینا دونوں بے معنی اقدامات تھے۔

اسی کمرے میں ہفتے میں ایک دوبار' مہینے میں کئی بار خان صاحب جا کر رہتے۔ شہاب بھائی ہمیشہ اصرار کرتے کہ تم میرے پاس والے پلنگ پر لیٹو۔ خاں ہمیشہ سرخ مشینی کارپٹ پر گاؤ تکیہ گدی کے نیچے پھنسا کر ایسے لیٹتے کہ شہاب بھائی کا چہرہ ان کے مقابل ہوتا۔

جب کروٹ لے کر کہنی پر سر ٹکا کر اور ایک ٹانگ کو تہہ کر کے دوسری ٹانگ پر رکھ کر خاں پاؤں کا تلوا ہاتھ سے بجاتے تو شہاب بھائی متوجہ ہو جاتے۔ چاہے رات کے ڈھائی بجے ہوں چاہے فجر کے بعد کا وقت...... وہ دونوں باتیں کرنے لگتے...... شہاب بھائی نے ثاقب کے علاوہ کبھی کسی کو اپنے کمرے میں سونے کی اجازت نہیں دی لیکن خاں صاحب کا فرشی بستر وہ خود لگوایا کرتے اور خاں صاحبؒ کے منتظر رہتے۔

ایسی ہی ایک وزٹ میں خان صاحب نے خواب دیکھا

آج رات یعنی ۷۷/۳/۲۷ اور ۷۷/۳/۲۸ کی درمیانی رات ایک عجیب خواب دیکھا۔ یہ خواب بہت طویل اور بڑا تفصیلی تھا۔

میں نے یہ دیکھا کہ ہم ایک بڑے سارے احاطے کے ایک چوبارے میں مقیم ہیں اور گھر کا صحن خاصا کھلا ہے۔ ساتھ رہائش کی کوٹھڑیاں ہیں لیکن ہم زیادہ وقت صحن ہی میں رہتے ہیں جہاں چارپائیاں وغیرہ بچھی ہیں۔ اس احاطے میں نیچے اور بہت سے لوگ ہیں اور ایک ونگ میں ایک لوہار خانہ سا بھی ہے جہاں ہر وقت سان چلتے رہتے ہیں اور ان پر چھریاں اور آرے تیز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ چھریاں مجھے اور میرے خاندان کو قتل کرنے کے لئے تیز کی جاتی ہیں۔ کچھ ہتھیار بھی بنتے ہیں۔ ٹھناٹھن کی آواز آتی ہے۔ میں اور قدسیہ اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں اور ہماری ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں...... ایک شام کا وقت ہے باباجی نور والے آئے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں کہ "بیٹا یہاں سے نکل چلو"۔ میں اور قدسیہ کہتے ہیں کہ یہ بہت مشکل ہے کیونکہ بلوائی ہم کو پکڑ لیں گے اور قتل کر دیں گے۔ باباجی کہتے ہیں کہ کسی کے ساتھ جھگڑنے یا بحث کرنے کی ضرورت نہیں بس چپ چاپ خاموشی کے ساتھ نکل چلو۔ ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب بھی ساتھ ہیں کہتے ہیں "حضور چپ چاپ جانے کی ضرورت نہیں بچ بچا کر نکلیں گے اور ان کے ساتھ مقابلہ کریں گے"۔ باباجی منع کرتے ہیں پھر ہم وہاں سے نکلتے

ہیں۔ قدسیہ نے ایک چادر اوڑھ رکھی ہے اس کی گود میں ہمارا بچہ اثیر ہے جس کی عمر مشکل سے سال ڈیڑھ سال کی ہے۔ دوسرے بچے شاید ہیں نہیں یا وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ہم سیڑھیاں اترتے ہیں باباجی آگے آگے ہیں اور ہم ان کے پیچھے...... بلوائیوں کو پتہ ضرور چلتا ہے لیکن وہ دور دور مجبور سے رہ جاتے ہیں۔ ہم خاموشی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے سہمے سہمے نکل جاتے ہیں۔ رات کا وقت ہے گلیوں بازاروں میں بڑا ہجوم ہے جیسے کوئی عید ہو اور لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے' رگڑ لگاتے سمندر کی لہروں کی طرح چل رہے ہیں۔ ہم بھی ان میں رواں ہیں پھر باباجی سے ہمارا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ ہم کو ایک خاص مقام پر پہنچنا ہے شاید مسجد وزیر خان تک یا سنہری مسجد تک لیکن ہمیں اس کا راستہ نہیں ملتا...... پھر ہم سواریوں کے ایک تانگے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس میں ایک خوبصورت بڑی سی عمر کی برقعہ پوش خاتون ہے۔ سفید رنگت' بھرا بھرا جسم اس نے نقاب الٹ رکھا ہے اور قدسیہ سے باتیں کر رہی ہے۔ قدسیہ کہتی ہے "بس جی ہم کو اپنی منزل تک جانا ہے لیکن راستہ نہیں ملتا"۔ وہ منزل کے اوپر لیکچر دینا شروع کر دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ یوں جاؤ یوں جاؤ۔ لیکن ہماری مدد نہیں کرتی۔ بس قال ہی قال ہے۔ میں قدسیہ سے کہتا ہوں قدسیہ ذرا اس بچے کو سنبھال کر رکھو یہ بچہ نہیں نور ایمان ہے۔ اس کی حفاظت لازمی ہے۔ وہ کہتی ہے "میں نے اس کو سینے سے چمٹا رکھا ہے آپ فکر نہ کریں"۔ پھر ہم تانگے سے اترتے ہیں۔ آدمیوں کا سمندر بدستور بل کھا رہا ہے۔ ہم ہر ایک سے راستہ پوچھتے ہیں لیکن ہر کوئی لیکچر سا دے کر چلا جاتا ہے۔ پھر ہم دونوں آگے چل دیتے ہیں چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں جیسے قصور شہر کی ہیں ان میں سے گزرتے ہیں۔ گلیاں مڑتی جاتی ہیں بل کھائے جاتی ہیں لیکن راستہ نہیں ملتا۔ ہم ٹوٹی ہوئی دیواروں کے موکھوں میں سے بھی گزر جاتے ہیں گول Tunnels میں سے بھی گزر جاتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا چوک آ جاتا ہے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں تو ایک دیوار پھسل کر سامنے آ جاتی ہے دوسری طرف جاتے ہیں تو ایک اور دیوار آگے بڑھ آتی ہے۔ ہم اپنے سے زیادہ اس بچے کو منزل کی طرف لے جانے میں کوشاں ہیں...... پھر میں گھبرا کر جاگ اٹھا خوف اور ڈر سے میرا بدن کانپ رہا تھا۔ میں نے دیکھا قدرت میرے قریب پلنگ پر گھوک سویا ہوا تھا اس کی ساتھ والی چارپائی پر ثاقب تھا۔ میں اپنے بستر پر بیٹھا رہا اور سوچنے لگا کہ اگر میں نے پھر سونے کی کوشش کی تو یہ خواب پھر شروع ہو جائے گا۔ پھر میں نے کہا اس خواب کو لکھ لوں صبح بھول جائیگا۔ لیکن اس وقت بتی جلانی نہیں چاہتا تھا۔ ناچار سو گیا۔ پھر وہ خواب نہیں آیا۔ صبح اٹھ کر یہ خواب نوٹ کیا۔

یہ خواب میں نے اس لئے یہاں لکھا ہے کہ ایسے ہی خواب وقفوں کے بعد مجھے بھی آیا کرتے

تھے۔

مجھے آج تک سمجھ نہیں آسکی کہ ہم دونوں کو ایسے خواب کیوں اور کیسے آتے رہے ہیں جن میں ہم پر پیچ راستوں پر ہیں اور رہنمائی کے بغیر نکل نہیں سکتے۔ اتنی سمجھ آگئی ہے کہ واقعی ہم غلط راستوں پر جانکلے پر یہ ابھی تک سمجھ نہیں آسکی کہ شاہراہ کیسے ملے گی؟ اور کیوں ملے گی؟ بابے کیسے کھینچ پائیں گے جبکہ دلدل سے نکلنے کو ہمارا اپنا دل نہیں چاہتا۔

جس سال بھٹو وارث تخت و تاج ہوا اور پاکستان کی عنان سنبھالی اس سال کے شروع میں مجھے دو خواب نظر آئے۔ دونوں میں نے مفتی جی کو لکھ دیئے اک خواب تو بھٹو کے انجام سے متعلق تھا۔ اور دوسرا یوگی کی خوش قسمتی کے بارے میں تھا...... میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک پہاڑی علاقہ میں ایک کشادہ سڑک ہے جس پر کار چل رہی ہے اور اس کار میں شہاب بھائی' میں اور خان صاحب سوار ہیں۔ لیکن کار جس قدر آگے جاتی اسی قدر پیچھے بھی دھکیلی جاتی ہے۔ پھر شہاب بھائی بولے......

"لاؤ اشفاق میں ڈرائیو کروں......۸۶ء تک تو میں ہی ڈرائیو کرلوں گا آگے تم لے چلنا"۔

کچھ دیر کار چلتی رہتی ہے پھر ایک ایسے مقام پر جہاں نشیب میں ایک خوبصورت گاؤں اور پشت کی جانب ایک آبشار ہے کار رک جاتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں خان صاحب' شہاب بھائی اور میں کار سے اتر آئے۔ اب گاؤں کی طرف سے تین ماڈرن تعلیم یافتہ نوجوان آگئے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پھل اور آٹو گراف تھے اور وہ بڑھتے چلے آتے تھے۔ خان صاحب ان لوگوں کے منتظر رہے لیکن شہاب بھائی بولے...... "اس آبشار کو دیکھو اشفاق! اس کا پانی چادر کی طرح گر رہا ہے اور شیشے کی طرح شفاف ہے۔ اس پر چل کر اوپر جانا ہوگا۔ یہی وقت ہے۔ یہی گھڑی ہے...... ایسی چڑھائی اگر اس مقررہ وقت پر نہ کی جائے تو پھر ممکن نہیں ہوتی......"

اتنے میں ہاتھوں میں پھل اور آٹوگرافیں لئے نوجوانوں کی وہ ٹولی وہاں تک آگئی جہاں سڑک کے کنارے لوہے کی زنجیروں کی باڑ ہے...... یہ نوجوان دیہاتی نہ تھے بلکہ لباس' تراش خراش اور گفتگو سے پڑھے لکھے، دولت مند اور نازک مزاج لگتے تھے۔ خان صاحب آٹوگراف دینے' باتیں کرنے اور پھل کھانے میں مشغول ہوگئے۔

کچھ لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ نظر آیا شہاب بھائی آبشار پر اوپر کی طرف چڑھ رہے ہیں۔ آبشار' جو شیشے کی طرح شفاف ہے' نیچے کی جانب بہہ رہی ہے...... ان کی پشت آبشار کی طرف ہے اور وہ بڑے اطمینان سے اوپر کی طرف چلتے جا رہے ہیں۔

انہیں جاتا دیکھ کر مجھے کچھ اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ میں نے خان صاحب کو گھسیٹا اور ہم دونوں بھاگم بھاگ آبشار تک پہنچے...... شہاب بھائی واپس لوٹے اور بولے......

"اشفاق وقت بہت ہی تنگ ہے آؤ چلیں"

"لیکن شہاب بھائی ہم تو پانی پر چلنا نہیں جانتے......" میں نے کہا

"پانی پر چلنا نہیں پڑتا...... جتنی تیزی سے یہ نیچے گرتا ہے اسی رفتار سے آپ کو اوپر دھکیلتا ہے"

"جانے دے قدرت...... ہمارے پاس کار ہے ہم پہنچ جائیں گے"

شہاب بھائی مسکرائے اور دونوں ہاتھ لجاجت سے آگے بڑھا کر بولے...... "تم دونوں کو کچھ کرنا نہیں پڑے گا بس مضبوطی سے میرے ہاتھ پکڑ لو...... پانی ہمیں خود بخود اوپر پہنچا دے گا......"

ہم دونوں نے ان کا ایک ایک ہاتھ بڑی مضبوط گرفت سے پکڑ لیا اور پھر محسوس ہوا جیسے نیوٹن کا اصول کارفرما ہے۔ جس تیزی سے آبشار گر رہی تھی اسی سرعت سے درمیان میں شہاب بھائی دائیں بائیں خاں اور میں آبشار پر اٹھتے جا رہے تھے...... جو خوف اور خوشی مجھے اس روز خواب میں محسوس ہوئی وہ ابھی تک میرے ساتھ ہے...... پتہ نہیں شہاب بھائی کو خان کی کون سی ادا پسند ہے......؟

شاید وہ جانتے تھے کہ اتنی افسرانہ شان والا فقیر ہے؟

شاید وہ سمجھتے ہوں کہ فقیری کے دروازے پر دستک دینے والا ابھی دروازہ کھلنے کا متحمل نہیں؟

ہو سکتا ہے شہاب بھائی یہ بھی جانتے ہوں کہ شہرت یافتہ خان کو گمنامی زیادہ پسند ہے؟

شاید کوئی بھی وجہ نہ ہو لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ لتھڑے ہوئے خاں صاحب کو دھو کر صاف کر کے چھوڑنا چاہتے تھے۔......

بڑی دیر کی بات ہے۔

ایک روز صبح کے وقت خان صاحب اور میں سیر پر گئے...... سردیوں کا موسم تھا اور ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں پر کہرے کے آثار تھے۔ خان نے گرم کمبل کا پنڈلیوں تک لمبا براؤن چیک کا ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ اچانک کسی جھاڑی میں سے ایک چھوٹا سا گد گدا' موٹی گردن' بادامی بال اور معصوم آنکھوں والا پلا نکل آیا اور خان صاحب کے سلیپروں کو آکر سونگھنے لگا۔ خاں دیہات سے آئے ہیں۔ وہ فطری طور پر فصلوں' درختوں' لمبے راستوں' اونچی آوازوں' جانوروں اور پرندوں سے وابستہ ہیں۔ پلے کو محبت پر آمادہ دیکھ کر وہ جھکے اور چند منٹ اس کے ساتھ کھیلتے رہے پھر ہم آگے نکل گئے۔ جب ہم اپنی سیر سے لوٹے تو وہ پلا بھیگی آنکھوں سمیت ابھی سڑک کنارے کھڑا تھا۔

خان نے اس کے سر پر پیار دیا اور ہم دونوں آگے آگے چل دیئے لیکن کچھ دیر بعد ہمیں احساس ہوا کہ پیچھے کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی پلا تھا۔ میں نے اسے دھتکارا کہ کہیں وہ وبال جان نہ بن جائے لیکن خان صاحب چپ چاپ چلتے رہے...... پلٹ پلٹ کر میں دیکھتی تو جس ہاتھ خاں ہوتے پانچ چھ قدم عین ان کے پیچھے پلا بھی چلتا نظر آتا۔ کچھ راستہ چلنے کے بعد وہ ہم سے

بچھڑ گیا...... لیکن خوشبو سونگھتا بھٹکتا رہا۔ خاں صاحب چونکہ بنیادی طور پر کسان ہیں اور فطرت کے قریب ہیں اس لئے وہ رکے ' پلے کا انتظار کیا اور جب وہ بالکل قریب آ گیا تو اسے گود میں اٹھا کر براؤن چیک والے ڈریسنگ گاؤن کے اندر سردی سے چھپالیا۔

گھر پہنچتے ہی خان نے نعرہ لگایا...... "ابھی راتب پکاؤ اور یوگی کو کھلاؤ......" پلے کا نام یوگی پڑ گیا۔ اس کے لئے گوشت منگا کر ابالا گیا۔ گھر میں ایک نئے فرد کے اضافے سے رونق بڑھ گئی۔ میں یوگی کو اٹھا کر گھر کے پچھواڑے لے گئی۔ جب اس نے ندیدے بچے کی طرح فل سائز بل ڈاگ جتنا راتب کھالیا تو میں نے اسے خوب نہلایا وہ اس درجہ غلیظ تھا کہ اس کے جسم سے چچڑ اتر اتر کر صابن کی جھاگ کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ خوب نہلانے اور برش کرنے کے بعد وہ چھوٹے سے قالین کے ٹکڑے پر لیٹ کر سو رہا۔ یوگی کے بال جوں جوں دھوپ میں خشک ہوتے گئے ویسے ہی وہ داؤدخانی گندم کے ستوں جیسا رنگ اختیار کرتے گئے...... اس کی آنکھیں سیاہ اور کان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طرح چہرے کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ وہ معصومیت کی تصویر تھا۔

دوپہر کے وقت بچے سکول سے لوٹے۔ سب کو فکر تھی کہ کہیں یوگی فرار نہ ہو جائے۔ کوئی سنگلی کا سوچ رہا تھا کوئی گول پٹے کا۔ کسی کا خیال تھا کہ یوگی کو اندر بند رہنا چاہئے اور جب تک وہ سب سے مانوس نہیں ہو جاتا کھلا چھوڑنا مناسب نہیں۔ میرا منجھلا بیٹا انیس خاں جانوروں سے بہت پیار کرتا ہے...... شہاب بھائی اسے صوفی کہا کرتے تھے۔ صوفی کے علاوہ گھر میں رہنے والا ایک سواتی لڑکا نثار بھی گھر آتے ہی یوگی کا عاشق ہو گیا...... انیس چونکہ دل کا نرم ہے اور کسی پر تشدد کرنا پسند نہیں کرتا اس لئے وہ سکیمیں بنا کر رہ گیا لیکن نثار نے یوگی کے گلے میں رسی باندھی اور اسے محبت کے ساتھ پھاٹک کے ساتھ باندھ دیا......

صبح نہ جانے کیسے یوگی نے رسی تڑوائی اور گیٹ سے فرار ہو گیا۔

شاید وہ ایک بل ڈاگ جتنا راتب کھانے آیا تھا۔ شاید وہ ڈرائی کلین ہونا چاہتا تھا؟ شاید وہ یہ تجربہ کرنا چاہتا تھا کہ اپنے پیاروں کے ہاتھ سے رسی گلے میں ڈلوا کر دل پر کیا بیت جاتی ہے؟

بہرکیف اشفاق احمد بھی بالکل ویسے ہی یوگی تھے جسے شہاب بھائی نے اٹھا کر اپنے میرون ڈریسنگ گاؤن میں چھپالیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے تن پر بڑے بڑے چچڑ ہیں جو اس کا لہو دن رات پیتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس خوبصورت پلے کے بال سنہری ' کان معصوم اور روح بہت ہی بھولی ہے۔ اسی لئے شہاب بھائی نے غلاظت کی پروانہ کی...... چچڑوں کو در خور اعتنانہ سمجھا اور اپنی بغل میں خان کو پناہ دی......

اس کے بعد جو بھی خان سے وابستہ تھا، شہاب بھائی کی ٹربل تھی۔ چاہے بانو، چاہے خان کے بچے، ان کے بچوں کے دوست، بیوی کی سہیلیاں، خان کے دوست، ملازم ...... جو بھی یوگی کا چچڑ تھا

شہاب بھائی کا بوجھ تھا اور وہ خوشی سے اسے اٹھاتے تھے جیسے سمندر اپنے سینے پر بجرے ' جہاز ' کشتیاں لئے پھرتا ہے۔

جس روز شہاب بھائی کا وصال ہوا اور ہم صبح اسلام آباد پہنچے ' خاں پہلی مرتبہ نہ تو کسی راز کے افشا ہونے سے ڈرے نہ ہی انہیں خوف آیا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ وہ اونچی اونچی رو رہے تھے اس بار یوگی گیٹ سے نکل کر نہ گیا تھا بلکہ لال گاؤن والے نے اپنا ستر پوش لبادہ اتار کر رکھ دیا تھا اور بیچارہ یوگی نہیں جانتا تھا کہ اب وہ سردی سے بچنے کے لئے کس کا ڈریسنگ گاؤن تلاش کر سکتا ہے؟...... یکدم دنیا اس کے لئے بہت غیر محفوظ جگہ ہو گئی تھی...... ڈریسنگ گاؤن چھپ گیا تھا اور ہر طرف چچڑ ہی چچڑ تھے...... جو اس کا لہو چوستے تھے...... دن رات...... دن رات...... ڈیمانڈ ہی ڈیمانڈ...... گلے ہی گلے...... اعتراض ہی اعتراض...... ہر طرف کانٹوں کے تاج۔

عفت کے جانے کے بعد شہاب بھائی وان پرست آشرم میں داخل ہو گئے۔

ہندو دھرم اور فلاسفی کے مطابق انسان کو اپنی زندگی کا طویل وقفہ چار حصوں میں تقسیم کر کے گزارنا چاہئے۔ پہلا حصہ بچپن ' لڑکپن اور نوبلوغت کا ہے جب وہ بڑھتا ہے اپنے بڑوں کے چہرے ' افعال اور خصائل دیکھتا ہے...... یہ کھانے پینے ' بڑھنے ' سیکھنے کے دن ہیں اس میں فطرت آزاد اور ذمہ داری کم سے کم ہوتی ہے۔ آدمی اپنی معصومیت کی کشتی میں سفر کرتا ہے۔ بالغ ہونے پر انسان پر گرہست کا بوجھ پڑتا ہے اور وہ بال پرست آشرم سے قدم اٹھا کر گرہست آشرم میں داخل ہو جاتا ہے...... بیس سے پینتالیس تک کا یہ وقفہ اولاد اور بیوی کی پرورش ' روزی کمانے کے جتن ' اپنی شخصیت کو بنانے کے دن ' دوستی ' موہ ' مایا میں پھنسنے کا وقفہ ہے۔ جونہی اولاد گرہست میں داخل ہو جائے ادھ بڈھے کو چاہئے کہ وہ ہولے ہولے گھر کی کنجی چابی بہو کے حوالے اور دوکان ' کارخانے کی ذمہ داری بیٹے کے ذمے لگائے۔ فاصلے سے دیکھتا رہے کہ کارخانہ کیسے چل رہا ہے داؤ پیچ سکھاتا رہے تجربہ بتلاتا جائے پر نہ گھر پر بہو کو ٹوکے نہ دوکان پر بیٹے کو...... اور جب کچھ عرصہ بعد وہ نسچنت ہو جائے کہ اس کے بغیر بھی دنیا چل رہی ہے اور چلتی رہے گی تو ایک روز آرام سے سر منڈوائے ' ہاتھ میں گڑوی لئے ' لمبا جنیو باندھے اور جپ تپ کرتا دوار کا سدھارے...... پھر نہ دنیا سے علاقہ رکھے نہ لوگوں سے۔ گنگا اشنان کرتا کرتا...... بھگوان کا نام لیتا ایسا ہو رہے۔

کبیرا ایسے ہو رہو جیسے نرمل نیر
پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر کبیر

گو شہاب بھائی پیدائشی نرمل نیر تھے لیکن وان پرست آشرم میں پہنچ کر سارے جوئے یکسر اتار کر ان میں ایک شان استغنا بھی پیدا ہو گئی تھی...... وہ ڈلک نرمل نیر کی مارتے تھے لیکن اسلام کے معاملے میں ہیرے

کی طرح سخت جان بھی تھے...... وہ فاصلے سے ثاقب کی دیکھ ریکھ' تربیت اور سلجھاؤ دیکھ رہے تھے۔ لیکن گھر' گھاٹ' دھوبی اور کتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ انہوں نے وہ تمام بوجھ اتار دیئے جو گرہست کی بنیادی ضرورت ہیں......

نہ ان کا کوئی گھر تھا نہ گھر والی

نہ ان کے کوئی ملازم تھے...... نہ خدمت گزاریاں

بجلی کا بل سوئی گیس...... پلمبر' گٹر کھولنے والا' خانسامہ' مالی'...... سب سے وہ آزاد تھے۔ وہ شانتی سے اپنی بہن کے گھر میں رہتے جو ملتا کھاتے...... ہر سال کوئی نہ کوئی مرغوب غذا' کوئی پیارا دوست' کوئی جان لیوا رابطہ ختم کر دیتے...... بازار صرف پھل خریدنے جاتے باقی خرید و فروخت انہوں نے دوسروں پر چھوڑ دی تھی...... پہلے کار خود چلاتے تھے پھر کار چلا تو سکتے تھے لیکن ثاقب یا کسی دوسرے بچے کے دست نگر ہونے میں لذت محسوس کرتے اس طرح مہاتما بدھ کا Begging bowl بغیر کسی اعلان یا کسی شو آف کے ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

جب انشا جی زندہ تھے اور عفت کو گئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ تو ہم لوگ اندر اندر یہ کھچڑی پکایا کرتے کہ شہاب بھائی کو دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ ان کے لیے ہم لوگ کچھ رشتے بھی تجویز کیا کرتے۔ اگر ہمارا بس چلتا تو ہم شہاب بھائی کو گرہست آشرم سے نکلتے ہی دوبارہ زنجیر پا کرتے۔ ایک روز انشا جی نے خان کی ڈیوٹی لگائی کہ آدھی رات کو جب پرائیویٹ گفتگو کا سشن شروع ہو تم شہاب بھائی کی خانہ آبادی کا سلسلہ جوڑو۔

شہاب بھائی ہمیشہ کی طرح خاں صاحب کی کلیشے بھری تجویزات سنتے رہے اور بڑی دیر بعد بولے "اشفاق تم میرا مطلب غلط نہ سمجھنا۔ عفت کے ساتھ جو خوشگوار وقت گزارا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں شادی کر لوں اور وہ بھی کسی لیڈی ڈاکٹر سے...... لیکن اب جی نہیں چاہتا...... جب ایک بار بیڑی کٹ جائے تو دوبارہ قید ہونے کا مقصد؟ دائرہ ختم کر کے دوبارہ دائرے کا سفر کیوں؟ اشفاق...... سنو

اک دن رہیں بسنت میں

اک دن جئیں بہار میں

اک دن پھریں بے انت میں

اک دن چلیں خمار میں

دو دن رکیں گرہست میں

اک دن کسی دیار میں

دو دن گرہست میں رکنے کے بعد شہاب بھائی مستقل طور پر اپنی بہن محمودہ کے دیار میں رہنے

لگے یہاں ثاقب کو بیٹھے بٹھائے ایک بڑی بہن گڈی، اور دو بھائی بلو اور پپل مل گئے...... امین صاحب جیسے پھوپھا ملے جو ثاقب کو اپنے بچوں کے ساتھ پاکٹ منی دیتے تھے...... اور محمودہ جیسی ماں ملی جو ازل سے پرورش کے دکھ بھوگتی آئی تھی۔

محمودہ جی اور شہاب بھائی سگے بہن بھائی تھے لیکن ایک بنیادی فرق ہے...... شہاب بھائی نے اپنے تمام فیصلے اللہ پر چھوڑ دیئے تھے وہ توکل، عجز اور محبت کی تصویر تھے اور محمودہ جی بچوں کو خدا کے سپرد کرنے کی اہل نہ پہلے کبھی تھیں نہ اب ہیں...... یہ نہیں کہ وہ کم عبادت گزار، متوکل صورت، اور متقی ہیں۔ بلکہ باریک سا فرق یہ ہے کہ یہ خاتون بھی تمام عورتوں کی طرح بچوں کی وجہ سے عارف دنیا ہے وہ دنیا سے اس لئے منہ نہیں موڑ سکتی کہ بچے دنیا کے بغیر پلتے نہیں وہ تمام معاملات اللہ پر اس لئے نہیں چھوڑ سکتی کہ اسے اندیشہ ہے کہ اللہ کہیں بھول نہ گیا ہو...... ہو سکتا ہے اسے کچھ اور ضروری کام ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کی مشیّت ہی کچھ اور ہو...... چونکہ محمودہ جی کا دل گواہی نہیں دیتا کہ اللہ عورت جیسا پالنہار ہو سکتا ہے۔ ؟ شاید وہ یہ بھی سوچتی ہیں کہ اللہ لاکھ شفیق سہی لیکن وہ ان چار بچوں کی ماں تھوڑی ہے کہ میری طرح سوچے ؟ جس قدر شہاب بھائی فکر سے آزاد تھے محمودہ جی اتنا ہی زیادہ وسوسے، اندیشے، ان ہونیوں، بدگمانیوں کے اُلجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتی رہتی ہیں۔

بچہ امتحان کی تیاری کرے...... محمودہ جی نفل پڑھتی ہیں

بچہ رزلٹ کا منتظر ہو...... تو بھی محمودہ جی جائے نماز پر ہوتی ہیں۔

ان چاروں میں سے کوئی لیٹ ہو جائے...... محمودہ جی کو نفل مانتے دیر نہیں لگتی۔

ان بچوں کو کوئی پریشانی ہو تو بھی محمودہ جی کے لئے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ بڑے صاحب سے ہاٹ لائن پر التجا کریں...... محمودہ جی اللہ کے گھر کی فقیرنی ہے جوان چاروں کے لئے مانگ مانگ کر ڈگریاں، رزق، بہوئیں، جوائی، گھر، صحتیں، ترقیاں لاتی ہیں...... ان کی خواہشیں بڑے گھر سے پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن انہیں اطمینان نہیں ہوتا اور ہر بار جب وہ نئی ریکوسٹ لے کر جاتی ہیں اندر ہی اندر خوفزدہ رہتی ہیں کہ کہیں اس بار میری خواہش رد نہ ہو جائے کہیں اس بار اللہ درخواست پر کاٹی نہ ڈال دے...... بچوں کی اس خیر خواہ کو کبھی یقین نہیں آیا کہ شاید بچوں کے معاملے میں اللہ بہتر سوچتا ہو...... وہ باقی تمام معاملوں میں اللہ کو آخری اتھارٹی مانتی ہیں۔ لیکن ثاقب، گڈی، بلو اور پپل کا جب بھی کوئی معاملہ ہو وہ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ان سے بھی زیادہ اللہ ان چاروں کا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔

محمودہ جی کا وقت بڑی روٹین کے ساتھ جائے نماز، غسل خانے اور باورچی خانے میں کٹتا ہے۔ جائے نماز پر وہ مانگنے میں مصروف رہتی ہیں۔ پھر جب انہیں یقین نہیں آتا کہ خدا سنتا اور مانتا ہے تو انہیں نروس بریک ڈاؤن سا ہو جاتا ہے اور وہ غسل خانے کا رخ کرتی ہیں...... اس درجہ فکر مند اور اندر سے گھبرائی رہتی

ہیں کہ انہیں سوئے ہضم کی ہمیشہ شکایت رہتی ہے...... پھلوں میں صرف کیلا کھا سکتی ہیں...... اناج میں آدھی روٹی...... وہ پیدائشی فقیر ہیں...... اپنے لئے نہ انہیں ریشم و کمخواب درکار ہے نہ آرام دہ پلنگ بستر...... اپنی ساری ضرورتیں انہوں نے سفر زندگی میں کہیں بھگتائی ہیں اور ان سے آزاد ہو گئی ہیں۔ لیکن جیسے ان مردہ خواہشوں سے بچوں کے لئے ان گنت خواہشات کا جاگ لگ گیا ہے۔ اب وہ دم بدم مانگتی ہیں...... ہر لحظہ خوفزدہ رہتی ہیں اور جب یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تب وہ باورچی خانے میں ان چار بچوں کے لئے کھانے پکاتی ہیں۔

محمودہ جی کی زندگی شہاب بھائی کی طرح سادہ نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سردیوں کی رات تھی سب ہمارے ماسٹر بیڈ روم میں جمع تھے۔ باتوں باتوں میں بچوں کی تربیت کا سوال اٹھا۔ شہاب بھائی نے کہا...... "میں نے سنا ہے کہ بھوبت، انیق خاں اور صوفی انیس خاں موٹر سائیکل مانگتے تھے پھر تم نے لے کر کیوں نہ دیا اشفاق!"

ہم تینوں بچوں کی تربیت بابا نور والے کے فرمودات کے مطابق کرنے کے آرزو مند تھے۔ بقول ان کے بچوں کی خواہشات کا اتباع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس طرح بچوں میں انا بڑھتی ہے اور خود ان کے لئے مسئلے کا باعث بنتی ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "ڈر لگتا تھا شہاب بھائی۔ کہیں کوئی حادثہ وغیرہ"......

شہاب بھائی مسکرائے اور بولے...... "غالباً میرا رسک تم سے کہیں زیادہ ہے۔ میرا فقط ایک بیٹا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس عمر میں موٹر سائیکل تیز چلانے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے لیکن ثاقب کے شوق کے سامنے میری یہ احتیاط بے معنی ہے"۔ شہاب بھائی نے ثاقب کو موٹر سائیکل خرید دی۔ اس کے سامنے کے دو دانت بھی تیزی کے تجربے میں ٹوٹے پر وہ موٹر سائیکل اس وقت تک چلاتا رہا جب تک وہ خود اس کے سسٹم میں سے نہیں نکل گئی۔ شہاب بھائی نے نہ موٹر سائیکل چلانے پر پابندی لگائی نہ اس کی رفتار پر کوئی لیکچر دیا...... لیکن ہم فیصلہ نہ کر سکے اسی لئے انیق خاں اور انیس خاں کو موٹر سائیکل لے کر نہ دے سکے۔

ثاقب کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں ریگل میں ڈاکٹر ژواگو کی فلم دیکھ رہی تھی اور ثاقب لندن میں تھا۔ سکرین پر ایک چھوٹا سا لڑکا اپنی ماں کے تابوت کو دیکھ رہا تھا معاً میری نظروں کے سامنے آنکھیں جھپکتا، پتھریلی خاموشی کے ساتھ تکتا ایک آٹھ نو برس کا لڑکا آ گیا۔ وہ کس قدر شہاب بھائی سے ملتا تھا۔ وہی ذہانت، شرارت بھری مسکراہٹ، ازلی اداسی اور تنہائی۔ ایک بار ہیگ سے شہاب بھائی نے مزاح میں لکھا تھا۔
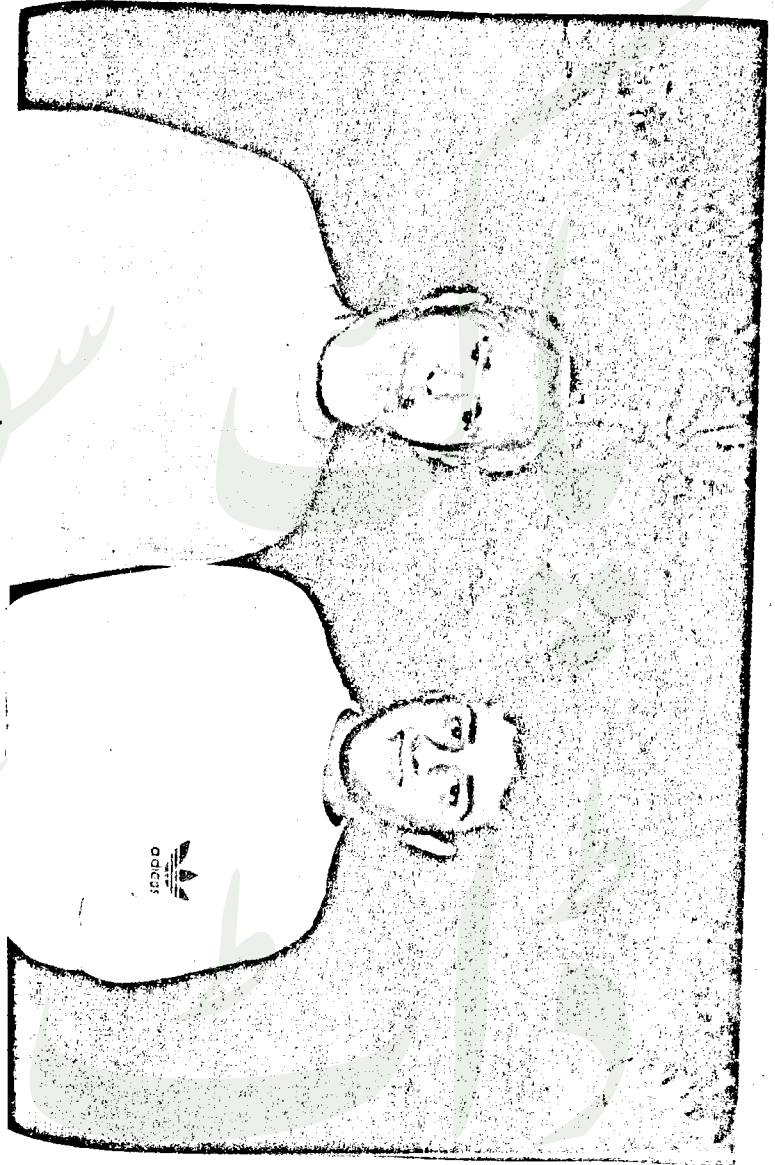
"اشفاق!

ثاقب خوب باتیں بناتا ہے۔ اگلے خط میں اس کی تصویر بھیجوں گا۔ راہ چلتی ہر میم اسے گھورتی ہے پیار کرتی ہے گال کھینچتی ہے پھر کہتی ہے

- What a sweet darling. Exactly looks like his father.

یہ کلمات سن کر عفت خار کھاتی ہے لیکن اپنا دل پشاوری ہو جاتا ہے"۔

بظاہر لگتا تھا کہ شہاب بھائی ثاقب سے بے نیاز ہیں۔ وہ اس کی آمدورفت، کھانے پینے، لباس پر نہ کوئی کمنٹ کرتے تھے نہ ہی مشورہ دیتے تھے لیکن مجھے یقین ہے اب، جب کہ وہ ثاقب کے پاس نہیں ہیں اب بھی وہ سلے لبوں کے ساتھ اور مندی مندی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ہیگ سے جب بھی خط آیا کرتا ثاقب کا ذکر ضرور ہوتا۔ ایک خط میں لکھا تھا۔

"ثاقب بدستور بولنے میں ترقی کر رہا ہے اب انگریزی کے لفظ بھی بذریعہ ڈچ سیکھ رہا ہے۔ کوئی راہ چلتا آدمی بھی چھینک مار بیٹھے تو متانت سے کھڑا ہو کر کہتا ہے حمد اللہ"۔ کوئی ذرا سی ٹھوکر کھائے یا گر پڑے تو فوراً کہتا ہے بش ملا۔ یہ بچے بھی خدا نے عجیب شے بنائے ہیں انسان کو دونوں عالم سے بے نیاز کر دیتے ہیں"۔

سردی کے موسم میں ان کا ایک اور خط ملا لکھا تھا۔

"عفت مرغی کی طرح ثاقب اور مجھے پروں کے نیچے دبائے آرام سے بیٹھی ہے۔ اسلم اور شیر محمد بھی سردی کے مارے ڈربے میں دبکے ہوئے ہیں۔ ثاقب کے لئے پنڈی اور ہیگ برابر ہیں۔ اپنی زبان بولتا ہے جب کسی کو انگریزی یا ڈچ بولتے سنتا ہے تو اس کے منہ کی طرف ٹک ٹک دیکھ کر پوچھتا ہے "اس کو کیا ہو گیا ہے" اب روٹھنے بھی لگا ہے اور اگر نوٹس نہ لیا جائے تو اعلان کرتا ہے "دیکھو میں گو چھے ہو گیا ہوں"۔

۱۹۶۶ء میں خبر گرم تھی کہ شہاب بھائی اب ہیگ سے واپس آنے والے ہیں۔ سفارت کے عہدے پر فائز یہ وقفہ انہوں نے بغیر کسی چیلنج کے گھر پر ہی گزارہ تھا۔ اس قیام میں انہیں ثاقب اور عفت کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اگست میں انہوں نے خان صاحب کو لکھا۔

"ثاقب پاکستان آنے کی خوشی منا رہا ہے اب بھی اس کا یہی خیال ہے کہ وہاں پر وہ ننگا پھرا

کرے گا کیونکہ گرمی ہوتی ہے۔ دھوپ والے دن یہاں کے ساحل سمندر پر جس انداز سے لوگ لیٹے رہتے ہیں، اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ دوسرا سوال اس کا یہ ہے کہ سمندر پر ننگے آدمی اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ "ٹکر مار کر" کیوں بیٹھتے ہیں؟"۔

ہیگ میں ایمبسڈری کے دوران عفت اور ثاقب کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک اور راستے کو بھی تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ فراغت کے لمحوں میں انہیں اپنے اندر چوری چوری کوہ نور کو تلاش کر کے تراشنے، چمکانے اور جڑنے کا وقت مل گیا۔ ۳۱ مئی کو انہوں نے خان کو لکھا۔

"یہاں آنے کے بعد دنیاداری کو بخیہ دے کر اپنی روحانی تربیت میں لگا ہوا ہوں۔ نماز، روزے کا چکر روز افزوں ترقی پر ہے۔ تقلیل طعام، تقلیل منام اور تقلیل کلام پر شدومد سے عمل جاری ہے۔ چنانچہ جب سے یہاں آیا ہوں اب تک ۱۹ پونڈ وزن کم ہو چکا ہے۔ تم تازہ تازہ دنبے کو ذبح کر کے ساڑھے نو سیر چربی نکالو اور اسے بڑے سے تسلے میں ڈال کر سامنے رکھو۔ پھر اندازہ کرو کہ ۱۹ پونڈ وزن گھٹنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر جسمانی، ذہنی، روحانی صحت کا احساس ہونے لگا۔ اس کے علاوہ یہاں آ کر دوسرا تحفہ یہ ملا کہ گھر کی زندگی کی چاٹ کچھ یوں استوار ہو گئی کہ باہر کی ہر چیز فضول نظر آتی ہے سارا وقت عفت اور ثاقب کے ساتھ گزرتا ہے یہی محبت افضل نظر آئی۔ باقی سب فروعات ہیں۔ خدا کی شان ہے کہ لوگ یورپ آ کر گھر سے بدکنے لگتے ہیں۔ لیکن راقم الحروف نے وطن سے نکل کر اپنا اصلی گھر دیکھا............وغیرہ وغیرہ"۔

یوں تو میں ثاقب سے اس وقت ملی جب میں نے اسے ڈاکٹر ژواگو کی فلم میں ایک کردار کی شکل میں دیکھا لیکن کبھی کبھی وہ مجھے نظر آنے لگا۔ ایک شام وہ پچھلے سی بلاک کے بازار میں "اصلاح گیسو" سے بال کٹوا کر آیا تو یکدم میں نے دیکھا یہ چھوٹا سا سانولا سلونا کرشن کنہیا خان صاحب کے سلیپر پہنے ہوئے انیق خان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ پھر یہ دونوں اندر غسل خانے میں چلے گئے انیق خان نے ثاقب کے بالوں میں شیمپو لگایا اور اس کے بال سنک میں ایسے دھوئے کہ ثاقب کی آنکھیں سرخ سی نظر آنے لگیں کچھ دیر بعد یہ دونوں ہارمونیم بجانے میں مشغول تھے انیس خان بیٹھے گا رہے تھے۔ اور ثاقب "جیوے جیوے پاکستان" بجانے کی مشق کر رہا تھا۔ ان بچوں کے توسط سے شہاب بھائی کی جانب ایک راستہ کھلا۔ پہلے جب عفت حیات تھی، ہم دونوں ان سب کی معصوم باتیں آپس میں کر کے خوش ہو لیتیں

تھیں اور عام ماؤں کی طرح شیخیاں مار مار کر سمجھتی تھیں کہ ہمارے بچے ساری دنیا سے نرالے ہیں۔ عفت کے جانے کے بعد ایسی گفتگو یکدم ختم ہو گئی۔ کچھ سالوں بعد اسلام آباد میں اچانک مجھے ثاقب کا ایک اور روپ نظر آیا...... وہ انگریزی میں بڑی حساس نظمیں لکھنے لگا تھا۔ ان نظموں میں اندرونی تجربات کی بالکل نئی پنیری لگی ہوئی تھی۔ میں یہ نظمیں کبھی کبھی خان صاحب اور شہاب بھائی کو سنانے لے جاتی اور چونکہ مجھے غلط وقت پر غلط بات کرنے کا بڑا ملکہ حاصل ہے اس لئے جب یہ دونوں دوست سیاسی گفتگو، شریعت اور طریقت کی باتوں کے منجدھار میں ہوتے میں ثاقب کی کاپی کا صفحہ کھول کر کہتی...... "شہاب بھائی آپ ثاقب کی نظم سنیں گے؟"

ANKS

lioness pats her cub
d is silent, quiet
ppy with life

e zebra's howl
s breath fading
s fine body flailing in the dust
A Thanks
his attacker
s carcass a Thanks to
vultures the ants, A
anks to
skewed nature of this world

l.

ild up your race
ild up your civilization
vittingly ceaselessly
essantly toiling
painful Thanks
pay.

nk you Thank you
the loneliness
success
l the despair of defeat
nk you for the warmth
not knowing
nk you for the obscurity that
s within each of us
nk you for the oblivion
at surrounds us

Thanks for viciousness and pain
Thanks for the stigma and shame
Thank you for the Good Things
And the Bad
And the Things That Just Are

Say your Thanks and rest awhile
For tomorrow you'll begin your Thank you's anew

SAQIB SHAHAB

BIRTH.

A drop falls
On a still still pond
Silently
Shatters the world

A lion roars, somewhere
Helpless, like man.
Stillness
Surrounds us

The child in the womb
Hears the silence. And
Is content
His brother is quiet.

SAQIB SHAHAB

.... مارے لحاظ کے دونوں چپ ہو جاتے۔ ان کی باڈی لینگویج سے پتہ چلتا گویا میں مخل ہوئی۔ لیکن جوں جوں میں نظم پڑھتی شہاب بھائی کا چہرہ خوشی سے شہابی ہوتا چلا جاتا وہ منہ سے تعریف کا جملہ کم کم بولتے لیکن ان کے روئیں روئیں سے تحسین اور واہ واہ کی خوشبو اٹھتی۔

شہاب بھائی چندراوتی سے ثاقب تک پیار ہی پیار تھے۔ وہ جب بھی محبت کرتے تو خود انہیں احساس ہوتا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہے لینے والے کی جھولی میں جگہ نہ رہتی لیکن وہ احساس ندامت میں غلطاں رہتے کہ حق ادا نہ ہو سکا...... میرا طریقہ یہ ہے کہ تحفہ دینے کے بعد اشارۃً گو پوچھتی ہوں فرمایئے اس کا رنگ پسند آیا؟ خدمت کرنے کے بعد دوسرے کے شکریئے کی آس ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی میں کسی کے لئے کرتی ہوں ہمیشہ اسے رجسٹر کرانے کی فکر میں رہتی ہوں شہاب بھائی ہوا میں اڑنے والے پولن کی طرح بار آور کرتے...... کہیں بیج پڑ گیا تو درخت بن گیا نہیں تو بنجر میں گرا اور تلف ہوا انہیں محبت میں لین دین سود و زیاں' احسان بے احسانی کچھ درکار نہ تھا...... وہ دلی کیفیت کو اشیاء کے حوالے سے نہیں جانتے تھے۔ محبت اس لئے کرتے کہ یہ ان کی اندرونی کیفیت تھی اس کا محبت پانے والے پر کیا اثر ہوتا تھا اس سے انہیں غرض نہ تھی۔ شہاب بھائی کی عادت تھی جب وہ ہمارے گھر دو چار روز ٹھہر کر جاتے تو جمعدارنی سرداراں کے لئے پچاس یا سو اور باقی گھر کی دیکھ ریکھ کرنے والوں کے لئے بھی ایسے ہی تناسب سے کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے جب وہ مجھے یہ رقم پکڑاتے تو ایک ہی جملہ مسکرا کر بولتے...... "یہ آپ کے Slaves کے لئے ہے......"

کبھی کبھی ازراہ مذاق میں کہتی...... "اور شہاب بھائی اگر میں یہ سب نہ دوں اور خود رکھ لوں؟ تو؟" وہ ہلکا سا اشارہ ہاتھ سے کرتے اور چپ ہو جاتے۔ ان کا بس ایک ہی اصرار ہوا کرتا...... کہ میں یہ رقم گھر کا کام کرنے والوں کو ان کی موجودگی میں نہ دوں۔

دینے دلانے کا سلسلہ بہت طویل تھا۔ کبھی ان کے گھر پر درجن بھر سلائی کی مشینیں دھری ہوتیں پوچھنے پر سب آئیں بائیں شائیں...... اگر تحقیق کرتے تو پتہ چلتا مفلوک الحال کچھ عورتیں ہیں ان کے لئے خریدی ہیں۔ بانو قدسیہ جب بہت بیمار ہوئیں اور شفایاب ہو کر گھر لوٹیں تو فون بیڈ روم سے بہت دور تھا۔ شہاب بھائی نے کارڈلیس کچھ اس طریقے سے خرید کر دیا کہ شکریہ ادا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مفتی جی' اشفاق احمد' انشاجی اور جانے کون کون سے ایسے گھر تھے جدھر انہوں نے توجہ دی اور رزق' خوشی' اولاد' محبت اور جانے کیا کیا برکتوں سے گھروں کو یوں بھرا کہ دروازے بند کرنے مشکل ہو گئے۔ لیکن شاید اس ذکر سے ان کو ناخوش کرنے کا احتمال ہے اس لئے میں اس موضوع کو نہیں چھیڑتی۔ وہ لمبے لمبے القاب' بے جا شکریئے' جھوٹی معذرتیں' الجھا دینے والے مناظرے' کسر نفسی کی گفتگو' تادیبی کارروائی' تنبیہی رویہ' سپاس ناموں کی زبان ناپسند کرتے تھے لیکن برملا انہوں

نے کبھی اس ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

شہاب بھائی' ممتاز مفتی' انشاجی اور اشفاق احمد کا ایک حلقہ تھا۔ اس حلقے کے محیط پر جمیل الدین عالی تھے جو کبھی مرکز میں داخل ہو جاتے اور کبھی خط مماس کی شکل میں دائرے کو چھو کر نکل جاتے۔ اس حلقے میں تمام خوبیاں گروہ کی تھیں لیکن ایک بات ایسی تھی جس کے باعث یہ گروہ کبھی سیاسی' ادبی اور معاشی دھڑے بندی کی طرح فعال نہ ہوا۔ یہ تمام قد آور شخصیتیں ارادے کی مضبوط تھیں اور اپنی اپنی سوچ رکھتی تھیں اور فرد کی طرح ایک ہو کر کسی نظریئے پر کام نہ کر سکتی تھیں۔ اسی لئے نہ ان میں کوئی ماننے والا پیدا ہوا نہ منوانے والا۔ انشاجی کوک پینے پر اصرار کر رہے ہیں۔ کسی دوسرے کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور وہ اکیلے ہی منہ لیسورتے بچوں کی منڈلی کو ساتھ لئے کوک پینے چلے جاتے ہیں۔ مفتی جی اونچے اونچے کہہ رہے ہیں آج سے وہ ناہنجار میرا دوست نہیں۔ شام کو وہی شخص اشفاق احمد کے گھر میں پگڑ باندھے احترام کی کرسی پر براجمان ہے۔ یہاں سفارش نہیں چلتی تھی نظریئے نہیں منوائے جاتے تھے۔ بس شہاب بھائی کی پھلواڑی تھی۔ نرگس' جوہی' یاسمین' گیندا بھی اپنی اپنی خوشبو کے ساتھ زندہ تھے اور حال مست رہتے تھے نہ کسی کو خیال آتا کہ چونکہ فلاں نے میری یہ بات نہیں مانی اس لئے اب سے میں قطع تعلق کرتا ہوں نہ اس بات کا احتمال ہی تھا کہ قطع تعلق کسی طور ہو بھی سکتا ہے۔ اختلافات کتنے بڑے کیوں نہ ہوں کوئی انہیں سلجھانے کی کوشش نہ کرتا...... یہ شہاب بھائی کی برکت تھی۔ وہ لوگوں کو نئے سرے سے پینٹ کرنے کے شوقین نہ تھے بلکہ اللہ کے بنائے ہوئے سارے رنگوں سے مفاہمت کر لیتے تھے نہ کسی کو فیشن کے طور پر اپناتے نہ اختلاف کی وجہ سے چھوڑ دیتے۔

بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں بنیادی طور پر یہی فرق ہے۔ بڑا انسان وہی ہوتا ہے جو دوسروں کے سارے تضاد' ان کی طبیعتوں کا فرق' حالات' خیالات سارے رنگوں کو خوش دلی سے قبول کرے۔ مسلک مختلف ہو تو اپنا مسلک چھوڑے بنا دوسرے کے اعتقادات کی تعظیم کرتا رہے۔ کلچر مختلف ہو تو اعتراضات کئے بغیر دوسرے کے کلچر کو بھی اچھا سمجھتا رہے رنگ' نسل' طبقاتی اونچ نیچ' لباس' زبان غرضیکہ زیادہ سے زیادہ تضاد اور فرق کو زندگی کا حصہ اور انسان کو انسان سے ممیز کرنے کی سہولت سمجھ لے۔ ان امتیازات کی وجہ سے نفرت کا شکار نہ ہو۔

شہاب بھائی نہ تو پولیٹیکل لیڈر تھے' نہ رفامر نہ واعظ۔ بڑے آدمی تھے۔ تجربے سے بڑا فرق یہ سمجھ کر قبول کر لیتے کہ یہ بھی اللہ کا بندہ ہے اس لئے نکتہ چینی اس پر سجتی نہیں۔ انہیں کبھی کسی کو ٹوکنے' سزا دینے' جھڑکنے تنبیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ ان کے نزدیک اختلاف' تضاد' فرق زندگی کا اصل اکسیر (Quite essence) تھا۔ ان کے نزدیک گوری لڑکی بھی پیاری تھی اور سیاہ سانولی بھی...... شیعہ مسلک بھی قابل احترام تھا اور فر فر انگریزی بولنے والا ڈچ کلین شیو عیسائی بھی۔

وہ مسجد نبویؐ کے سامنے بیٹھی ہوئی سیاہ فام افریقی عورتوں میں بھی بڑے آرام سے بیٹھ کر اپنی چپلیوں کے بکل بند کرتے رہتے جس آرام اور سہولت سے وہ پریذیڈنٹ ہاؤس میں کورس پر کورس کھانے میں مشغول ہوتے۔ بہت پڑھے لکھوں کی محفل ہو یا چٹے ان پڑھ لوگوں کی وہ نہ کسی پر بار گراں بنتے نہ کسی کو کوہ گراں جانتے...... میں نے انہیں کبھی امیروں پر نکتہ چین نہ پایا نہ ہی کسی ڈھیلی کھاٹ پر بیٹھ کر سلور کے کٹورے میں پانی پیتے ہوئے انہوں نے کسی غریب سے نفرت کی۔

رنگ سب چلتے تھے
زبانیں تمام درست تھیں
لباس سبھی موزوں تھے
علاقے تمام خوشگوار تھے
موسم تمام اچھے تھے
مذاہب سب اپنے اپنے پیرو کاروں کے لئے درست تھے۔

بس ایک بات پر وہ کبھی سمجھوتہ نہ کر سکے لیکن اس کا ذکر ان کی زبان سے ادا بھی نہ ہوا۔ ایک کوہ نور ہیرا انہوں نے اتنے پردوں میں چھپا رکھا تھا کہ شاید ان کے قریب ترین دوستوں کو بھی علم نہ ہوا ہو کہ اس ضمن میں نہ وہ کچھ سن سکتے ہیں، نہ برداشت کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ رسول اللہؐ کی ذات تھی۔ جانے وہ کیسے آویسی تھے کہ بولے بنا' اس نام کا ذکر کئے بغیر' کسی کے ساتھ اپنا جذبہ ڈسکس نہ کرتے ہوئے وہ ایک چارج سے بھرے رہتے تھے وہ لوگوں سے زیادہ ہاتھ نہ ملاتے بغلگیر نہ ہوتے اور اسکی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ جانتے تھے جس چارج سے وہ بھرے ہیں شاید اس کے لگتے ہی عام آدمی شوٹ نہ کھا جائے۔ اور اس انرجی سے اسے نقصان پہنچے جو ان سے ہر وقت نکلتی رہتی تھی۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ ایک بلند و بالا شخصیت شہاب بھائی سے ملنے آئی۔ ان کا قیام سعودی عرب میں تھا مکہ مکرمہ اور مسجد نبویؐ میں وہ بار بار گئے تھے اور کئی عمرے کر چکے تھے۔ ان کا عربی لب و لہجہ کھنک دار' گفتگو رواں' آنکھیں جذبے سے پر اور قلبی واردات کا سلسلہ بغیر روک ٹوک جاری تھا۔ شہاب بھائی کے مہمان پر مذہبی یو فوریا طاری تھا...... وہ بڑے جذبے کے ساتھ بار بار رسولؐ اللہ کا نام' ان کی زیارت' خوابوں میں آنا بڑی تفصیلوں سے بیان کر رہے تھے۔ شہاب بھائی مؤدب بیٹھے تھے لیکن ان کی ناک اور ہونٹوں کے زاویئے سے لگ رہا تھا گویا ساری گفتگو ان پر گراں گزر رہی ہے اب مجھ سے ایک فاش غلطی ہوئی۔ میں چونکہ بنیادی طور پر ڈرامانویس ہوں اس لئے مکالمے میں میری جان ہے۔ جس وقت اس خوبرو شخص نے مسجد نبویؐ میں اپنا ایک روحانی تجربہ بیان کیا تو میں نے بھی ڈائیلاگ میں مار نہ کھانے کی غرض سے اپنا ایک خواب جھوٹ سچ ملا جلا کر زور بیان کی مدد سے سنا دیا۔

اس بیان کے دوران بھی بادل نخواستہ شہاب بھائی چپ رہے نہ مجھے ٹوکا نہ ہی روکا نہ کسی وقت ناراضگی کا اظہار کیا۔ شام کو وہ اسلام آباد چلے گئے اور دوسری صبح مجھے ان کا فون آیا آواز میں نہ شدت تھی نہ تنبیہ نہ وہ نصیحت کر رہے تھے نہ سمجھانے کا انداز تھا...... بس میری بہتری خیر خواہی مقصود تھی...... کہنے لگے...... روحانیات' کشفیات وغیرہ کی واردات قلبی سراسر ذاتی تجربہ ہے اگر انہیں ظاہر کر کے ان کی تشہیر کی جائے تو یہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اس لئے ان تجربات کو ہر کس و ناکس پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی سے باطنی اور روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی جا رہی ہے تو اُس سے کسی صورت چھپانا ٹھیک نہیں' کبھی کبھی یہ واردات تصوراتی ہوتی ہیں یا قوت متخیلہ کی کرشمہ سازی اور انسان خواہ مخواہ گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ میرے لئے ان کی پہلی اور آخری سرزنش تھی۔

اس کے علاوہ شہاب بھائی کا گروہ فرداً فرداً اور مجموعی طور پر اتنا بڑا تھا کہ میرے نمانے وجود کے لئے اس گروہ کا وجود ہی ایک بہت بڑی سرزنش تھی۔

ان بڑے لوگوں میں میرا وجود ن کے نکتے کا سا تھا...... کبھی وزن شعر میں فٹ نہ آتا تو نکتہ گرا دیتے کبھی صورتاً ساتھ رہتا لیکن بلایا نہ جاتا۔ کبھی سجاوٹ کے طور پر لکھ دیتے لیکن معنی ہوتے کہ پڑھا نہ جائے۔ سید وارث شاہ کہتے ہیں۔

اہناں ہرنیاں دی عمر ہو چکی جو پانی شیر دی جوہ دا پیندیاں نیں

میں بھی ایک ایسی اندھی ہرنی تھی جو بڑی معصومیت سے شیروں کے ساتھ سرکس میں کام کرتی تھی۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنے بڑے ادیبوں نے مجھے اپنے ساتھ لٹکائے پھرنے کا اعزاز کیسے دیا؟ گو میرا کچھ بھی لکھا ہوا یہ لوگ نہیں پڑھتے تھے لیکن کبھی کبھی شاباش کے طور پر مفتی جی ضرور دل رکھتے اور تعریف کرتے...... شہاب بھائی کو مجھ جیسے پنکھا قلی پر ترس آ گیا جو برس ہا برس ٹھنڈے کمرے سے باہر بیٹھ کر پنکھا جھلتا رہتا ہے اور اندر ٹھنڈے میں لیٹنے والے صاحب لوگوں کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ پنکھا قلی کو ہوا لگنی تو در کنار چھت میں لگا ہوا بڑا پنکھا بھی نظر نہیں آتا............ پھر شہاب بھائی نے اپنی Wishing سے میرے لئے راستہ نکالا اور "راجہ گدھ" کا چرچا ہونے لگا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اگر یہ کتاب شہاب بھائی کے علاوہ کسی اور کے نام معنون ہوتی تو اس کا جانے کیا حشر ہوتا؟۔

ہر انسان جب کسی دوسرے شخص کو جانتا ہے یا اس کے قریب ہوتا ہے تو اپنی ضرورت کے تحت فاصلہ کم کرتا ہے۔ میرے بیٹے اثیر خاں کی پیدائش کے سال بھر بعد سے لے کر عفت کی وفات تک کا عرصہ میں نے ایک خاص کیفیت میں گزارا۔ یہ بارہ تیرہ برس کا وقفہ راجہ گدھ کی جسٹیشن کا عرصہ اور میری جلاوطنی کا عہد ہے۔ میں ایک کابوس کی گرفت میں رہتی تھی۔ دن اور رات مجھ پر

گزرتے نہیں تھے لرزاں رہتے تھے۔ میں پتے پر ٹکی ہوئی بارش کی بوند جیسی زندگی بسر کرتی کچھ اپنے نم وجود پر پشیماں کچھ پتے کی چکنی جلد سے ہراساں۔

میری طبیعت میں خوف اور حزن پیدائشی طور پر ودیعت ہے ہاتھ پر جو گرڈل آف وینس ہے وہ مجھے شانتی اور آنند سے رہنے نہیں دیتا...... بدلتے موسموں کا خوف' لوگوں کی ناراضگی کا خدشہ' کچی باتوں کے افشا کا ہراس' بچھڑے دوستوں کی از سر نو ملاقات کا ہول' حالیہ دوستوں سے بچھڑ جانے کی دہشت' رشتہ داروں کی تیوریوں کا ڈر' اولاد کے مستقبل کا خدشہ' شوہر کی ناراضگی کا کھٹکا...... یہاں سے وہاں تک خوف ہی خوف ہیں۔ جو دن بھر میں بھیس تو بدل لیتے ہیں لیکن غائب نہیں ہوتے۔ جو آدمی طبعی طور پر بزدل ہو وہ کرائسس کے لمحات میں یا تو روتا ہے یا بھاگ جاتا ہے لیکن اگر ایسا شخص ادیب ہو تو وہ کرائسس خوف اور حزن کی چھلنی میں سے نکل نکل کر تجزیئے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آج تمام پاکستانی اپنے وطن کے حوالے سے خدشے اور ہراس کا شکار ہیں اسی لئے گھر گھر تجزیئے ہیں۔ کچھ لوگ معاشرتی اور معاشی نقائص نکال رہے ہیں۔ کچھ سوپر پاورز کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے سسٹم درست نہیں۔ کئی ذہین لوگ تعلیم کو ویلن گردانتے ہیں۔ کچھ صاحب دل لوگوں کا خیال ہے کہ سیاسی خلاء نے یہ ابتر حالت بنا رکھی ہے...... شاید بہتیرے اندر ہی اندر سمجھتے ہیں کہ خوف اور اس سے پیدا ہونے والا حزن ہی تمام ابتری کی جڑ ہے۔ یہ خوف فرد اور قوموں کو مفلوج کرنے کو کافی ہے...... میں اس چھلیڈے کے ساتھ پورے بارہ برس رہی ہوں...... مجھے معلوم ہے کہ بھیئے کا چھلاوا لمبا ہونا چاہے تو آسمان تک دراز ہو سکتا ہے گھٹنا چاہے تو کالی مرچ بن کر گردن کی شہ رگ پر آ بیٹھتا ہے۔ یہ سیامی بکری کی طرح لش لش کرتا یوں آگے آگے بھاگتا ہے کہ کبھی باڑھ کے باہر کبھی کمرے کے اندر مگر پکڑا نہیں جاتا...... کبوتر کے پوٹے کی طرح جاندار اور الو کی آنکھ سا ہمیشہ کھلا...... خوف کا ذائقہ دل' زبان اور آنکھ میں ہمیشہ رہتا ہے...... اس کے ہاتھوں تنگ آ کر انسان خوشامدی' ڈرپوک' بزدل' جھوٹا اور جھینپو ہو جاتا ہے...... خوف نہ صرف شخصیت کو کھا جاتا ہے...... بلکہ ایمان اور روح بھی اس کی زد میں رہ کر موسم زدہ لکڑی کی طرح کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔

خوفزدہ ماں جب بچے پالتی ہے تو وہ انہیں اتاترک' ٹیپو سلطان' اور رضیہ سلطانہ نہیں بنا سکتی اسی طرح میں نے بھی جب انیق خاں' انیس خاں اور اثیر خاں کو پالا توان کو وراثت میں' تعلیم میں' گفتگو میں' رہن سہن میں وٹامنز کے ساتھ ساتھ چیچ چیچ وہ خوف بھی پلانا شروع کیا جو میری طبیعت ثانیہ تھی۔ میں ان تینوں کو لے کر کسی کے گھر مشکل سے جاتی کہ شاید یہ کوئی شرارت کریں اور صاحب خانہ کو ناگوار گزرے۔ میں انہیں ان کے دوستوں کے گھر بھی نہیں جانے دیتی تھی کہ مبادا کل کلاں کوئی جوابدہی کی صورت نکلے...... ہر قدم پر احتیاط...... ہر لحظہ نگرانی...... روک ٹوک...... نصیحت جھڑکی......

کہتے ہیں جس گھر میں ایک بڑا آدمی ہو وہاں بونے پیدا ہوتے ہیں۔ چھتنارے درخت تلے کی پنیری جب تک اکھاڑ نہ لی جائے مر جاتی ہے یا بونے درخت پیدا کرتی ہے...... میرے تینوں بیٹے سعادت مند شریف اور ڈرے ہوئے بچے تھے کیونکہ وہ دو جنوں کے درمیان رہ رہے تھے۔ جب کبھی مفتی جی ہمارے گھر آتے تو بند کمروں میں وہ میرے بچوں کے ہول نکالنے کا عمل کرتے لیکن مفتی جی اپنی تمامتر انکساری کے باوجود خود قد آدم سے بڑے ہیں اس لئے تھوڑی دیر بچوں کے خوف کی ہوا خوری کراتے اور پھر اپنے نوگزے قد سے اور بھی خوفزدہ کر کے چلے جاتے۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ شاید میرا خوف مریضانہ تعلق اور پیاروں کی بہی خواہی کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس معاملے میں غالباً تمام عورتیں اور خاص کر محمودہ جی بالکل میری طرح ہیں۔ ہم دونوں خیر خواہی' سلامتی' ترقی' فروغ کے جو خواب اور مفروضے اپنے پیاروں کے لئے ایک بار اندر بنا لیتی ہیں، وہ ہمیں تنکوں کی طرح اڑائے پھرتے ہیں۔ شہاب صاحب کی وجہ سے اور محمودہ جی کے باوجود ثاقب' بلو' پیپل اور گڈی تو بچ گئے لیکن میں نے اپنے بچوں کو جنم گھٹی بھی خوف کی دی...... گڑتی بھی ہراس کی کھلائی۔ اور پہلا دودھ بھی ڈر کی بکل تان کر پلایا......

عفت کی رخصتی کے بعد ایک شام اچانک بڑی زور کی آندھی چلی۔ ہمارے برآمدے میں جالی کے دروازے اور کھڑکیوں سے مٹی سے لدی ہوا آ رہی تھی۔ کوٹھے پر سٹوڈیو کا دروازہ پٹاخ سے بند ہوا۔ پھر باہر سندری کے درخت کی ڈالیاں زور زور سے جھولنے لگیں...... ڈرائنگ روم کی دو دروازہ نما کھڑکیاں کھلی تھیں ان کے آگے لگے پردے کمرے کے وسط تک آ آ کر اپنی مرضی سے پھڑپھڑانے لگے...... غسل خانوں میں لوٹے بھاگے لان میں گملے اوندھے ہوئے۔ پنکھوں کے سوئچ بند تھے لیکن پنکھے آدھی پونی رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ پلنگوں سے چادریں اڑ کر کونوں میں رول ہو رہی تھیں...... اور گھر کے ملازم اور بچے شیشے کی کھڑکیاں دروازے بند کرنے میں مشغول تھے...... انیق خاں کے غسل خانے کا دروازہ مسلسل بج رہا تھا۔ جیسے آندھی میں میرا دل بجتا ہے کچھ آنسوؤں کی دستک سے کچھ جانے ان جانے خوف کی آہٹ سے۔

پھر اچانک بتی چلی گئی...... سارا گھر آندھی اور نیم اندھیرے کی لپیٹ میں آ گیا۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ میں نے پینٹری کی کھڑکی کا رخ کیا عموماً یہاں لالٹین دھری رہتی ہے کھڑکی سے باہر میں نے آسمان کی طرف دیکھا وہاں چھ سات روز کا چاند ملگجی آندھی کے پیچھے دکھائی پڑتا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر آندھی چڑھی مٹی میں ایک ستارہ بھی ٹمٹما رہا تھا۔ اس ستارے کو دیکھ کر معاً مجھے خیال آیا کہ بچپن میں مجھے آس تھی کہ میں وہاں لوٹ جاؤں گی لیکن اب زمانے کی آندھیوں نے اسے بھی دھند میں چھپا دیا اور پلٹ جانے کی کوئی امید نہ رہی تھی... ساتھ والوں کے اپلی کا درخت چینی بھوت کی طرح

گول مٹول ہل رہا تھا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلائی لیکن مجھے پتہ نہ چلا کہ لالٹین کدھر سے اور کیسے کھلتی ہے؟ پھر مجھے لالٹین سے ہی ڈر آنے لگا اگر یہ نہ کھلی اور اندھیرا بڑھتا گیا تو میرے بچے کیا کریں گے اس وقت جب میں اس اندیشے کے زیر اثر تھی اور لالٹین کی ہر کلا مروڑ کر دیکھ رہی تھی مجھے بھول چکا تھا کہ سارا گھر آوازوں سے بھرا ہے میں کسی کو بھی بلا کر لالٹین جلانے کا حکم دے سکتی ہوں۔ لیکن آندھیاں، بارشیں، برفیں ...... پت جھڑ میں گرتے پتے، گرمی میں کھلے ہوئے املتاس کے پھول ...... ڈیوس روڈ پر لگے ہوئے فلیم آف دی فارسٹ کے درخت ...... ان گنت چیزیں مجھ میں تبدیلی کا ہول جگاتی ہیں۔ جیسے کچھ ان ہونا ہو کر رہے گا ......

میرے خدا اور زندگی نے ہمیشہ مجھ پر رحم کھایا۔ خود میں نے اور میری طبیعت نے ہمیشہ اس رحم میں سیندھ لگائی۔

بڑی دیر لگا کر ہزار جتن سے لالٹین جلا کر جب میں نے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھا تو آندھی چاند کو بھی کہیں اڑا کر لے گئی تھی اور صرف ستارہ رہ گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دعا کی کہ اے میرے رب تو جانتا ہے کہ میں بے اصل اور کمزور ہوں ...... میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس کے سہارے کو میں مضبوطی سے پکڑ سکوں جو میرے خوف کے آگے ڈھال بن کر چلے ...... تو مجھے کوئی ایسا وسیلہ دے جو میری ناطاقتی، ناسمجھی، نا اہلی کا بوجھ اٹھا سکے ...... جو باپ کی مانند میری ٹوٹی پھوٹی بات سمجھ سکے ...... جو ہر غلطی، قصور، گناہ کے بعد باپ ہی کی طرح میری رعایت کر سکے ...... چند ثانئے گزرے تھے کہ مجھے سلیپروں کی آواز آئی پھر شہاب بھائی نے ہوا سے بجتے دروازے کو پکڑ کر پوچھا ...... "کوئی موم بتی ہو گی بانو؟ ......"

وہ جانتے تھے کہ جس گھر میں کبھی کبھی بستر کی چادر، تولیہ، غلاف، نمک، کالی مرچ نہیں مل سکتی وہاں وثوق سے موم بتی بھی مانگی نہیں جا سکتی۔

" لالٹین ہے شہاب بھائی اور ایک ٹارچ ہے خان صاحب کی ......"

" لالٹین ٹھیک ہے ...... ٹارچ آپ رکھ لیں ......"

انہوں نے لالٹین مجھ سے لی۔ اس کا ہوا کی وجہ سے شعلہ بھڑک رہا تھا اس کا ڈھکنا بند کیا جب روشنی کی لاٹ ساقط ہوئی تو لالٹین لے کر وہ برآمدے میں چلے گئے۔ پھر انہوں نے یہ لالٹین کاسنی کمرے میں لے جانے کے بجائے برآمدے میں رکھ دی سارا صحن نمابر آمدہ روشن ہو گیا میں کچھ دیر گودام میں، کمروں میں، فیوز باکس میں، لکھنے والی میز کی درازوں میں موم بتی تلاش کرتی رہی کچھ دیر کے بعد ایک موم بتا مجھے مل گیا جو انیس خاں نے بہت ساری موم اکٹھی کر کے بنایا تھا۔ جب میں اسے جلا کر باہر پہنچی تو شہاب بھائی چپ چاپ برآمدے کی بنچ پر بیٹھے تھے۔ بچوں نے باہر لان میں فوارہ چھوڑ رکھا تھا

آندھی کی رفتار کم ہو گئی تھی اور انیق خاں کے غسل خانے کا دروازہ اب شائستگی کے ساتھ کافی دیر کے بعد بجتا تھا۔ میں شہاب بھائی کے پاس بیٹھ گئی۔ کافی دیر ہم دونوں بچوں کو فوارے میں کھیلتا دیکھتے رہے۔

میں نے اپنی کسی کمزوری کا ذکر نہ کیا انہوں نے کرید کے ساتھ کچھ نہ پوچھا نہ میرے حالات زندگی، نہ ہی میرے اندر رہنے والے وسوسے، خوف اور ان کی نوعیت۔

بس اس روز ارشاد ہوا۔

"خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں، خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور دنیا ان سے دور بھاگتی ہے ...... خواہش کو اپنے پیچھے پھینک دو ...... اللہ پر بھروسہ کرو ...... دنیا مثل سائے کے پیچھے پیچھے بھاگے گی ...... منفی بات سوچیں گی تو منفی کا امکان بڑھے گا مثبت سوچ ہو گی تو مثبت واقعات کی قطار لگ جائے گی ......"

"شہاب بھائی میرا دل بہت ڈرتا ہے؟ ......"

"کس لئے؟ یاد رکھو اول تو اللہ تعالیٰ کسی کا نقصان نہیں کرتے اور بفرض محال جس کو آپ نقصان سمجھیں ہو بھی جائے تو تلافی کے ہزار راستے ہیں ...... اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں"۔

اس کے بعد انہوں نے مجھے کچھ پڑھنے کے لئے عطا کیا۔

"لیکن شہاب بھائی میں ایسے وظیفے پڑھنے کی عادی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں۔ ایسی صورت میں آپ ہی کچھ دعا کر دیجئے ......

انہوں نے دعا کا وعدہ کیا اور کاسنی کمرے میں عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ اندیشوں نے ایک کن جوڑ، منجمد شکل اختیار کرنا شروع کی۔ چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں کی شکل میں راجہ گدھ تشکیل پانے لگا۔ جوں جوں کتاب صفحوں پر اترتی گئی، مجھ پر چھائے ہوئے خوف اور حزن کا بادل چھٹنے لگا۔ آندھیوں سے میں سائباں تلے آبیٹھی۔ کرب کے ایک لمبے سفر کا اختتام ہوا۔

تب مجھے پتہ چلا کہ دعائیں تو سبھی مانگتے ہیں اور سبھی کی پوری ہوتی ہیں۔ لیکن شہاب بھائی مجسم دعا تھے۔ وہ جس کے لئے دعا کر دیتے اس کا بیڑا پار ہو جاتا۔ ان کی نظر میں آ جانا ہی خدا کے گھر کی ایک بڑی سفارش تھی۔

پھر یوں ہوا ......

میں ۸۴ء کے شروع میں بڑی بیمار ہو گئی اور مجھے خون کی کمی کے باعث ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں واصف علی واصف صاحب دوسرے تیسرے میری طبیعت کا پوچھنے آیا کرتے تھے ایک روز بے حد گرمی میں جب باہر لو چل رہی تھی واصف صاحب مجھے ملنے آئے۔ اس وقت وہاں اجمل نیازی بھی

موجود تھے۔ اتنی گرمی میں موٹر سائیکل جیسی سواری پر آنا اور عیادت کو خاموش تفکر سے ادا کرنا، اپنی توجہ کے کہرا سے دوسرے کی تکلیف کو تنکے سا اٹھانا واصف صاحب کا ہی کمال ہے۔

اجمل نیازی نے سوال کیا...... "واصف صاحب یہ بتایئے کہ عبادت کی حقیقت کیا ہے؟"

وہ چند لمحے چپ رہے پھر بولے...... "کچھ لوگ پیدائشی عبادت گزار ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی نزدیکی چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ عبادت کی استطاعت نہیں رکھتے انہیں صاحبان عبادت سے رجوع رکھنا چاہئے...... مثلاً شہاب صاحب کو دیکھ لینا ہی عبادت ہے...... ایسے انسان کے لئے جو عبادت کا مقدور نہ رکھتا ہو...... ان کو دیکھتے رہنا کافی ہے۔"

"میں آپ کی بات مکمل طور پر نہیں سمجھا......"

واصف صاحب بولے...... "کسی ملک میں ایک ٹھٹھیرا رہتا تھا۔ وہ بڑا مفلس تھا اور معمولی ظروف پیتل، کانسی اور دھات کے بنا کر بیچا کرتا تھا۔ لیکن یہ ٹھٹھیرا بڑا آرٹسٹ تھا۔ خالی اوقات میں اندر والی کوٹھڑی میں بیٹھ کر ایک ایسا خوبصورت ظرف بنایا کرتا جس پر خوبصورت نقش و نگار تھے۔ موتی اور فیروزے جڑے تھے۔ پندرہ سولہ برس میں یہ صراحی تیار ہوئی لیکن اس ٹھٹھیرے کی دو کان چھوٹی تھی اور روسا کا ادھر گزر نہ تھا۔ اس لئے اس خوبصورت ظرف کا کوئی خریدار نہ ملا۔

بالآخر ایک روز ٹھٹھیرے نے سوچا کہ ایسا قیمتی برتن اس چھوٹی دو کان میں محفوظ نہیں اسے گھر لئے چلتا ہوں وہاں طاق میں رکھوں گا۔ شام کو اس کے پہلو میں دیا روشن کروں گا جب یہ جگمگائے گا تو صحن میں اس کے قیمتی پتھروں کی روشنی پھیلے گی۔ آنگن میں کھیلنے والوں کے چہرے اس کی روشنی سے کچھ سیکھ جائیں گے۔ ٹھٹھیرے نے ظرف کو بغل میں اٹھایا دو کان مقفل کی اور بازار میں چلا آیا تا کہ گھر جائے...... اتفاق سے اسی وقت بادشاہ کی سواری ادھر سے گزری۔ بادشاہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک مفلوک الحال آدمی بغل میں ایک بے انتہا خوبصورت منقش صراحی اٹھائے مودب کھڑا ہے سورج کی کرنیں جب ظرف پر پڑیں تو وہ ایسے جگمگایا کہ بادشاہ ششدر رہ گیا۔ ٹھٹھیرے کو پاس بلایا سواری سے اترا۔ صاحب کمال کو ساتھ لیا اور ظرف کی منہ منگی قیمت ادا کی۔ توشہ خانے سے خلعت سواری اور پرگنے علیحدہ موصول ہوئے......

تو یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ اندر والے کمرے میں جو ظرف تیار کرتا ہے اور جب باہر لاتا ہے تو توفیق کی کرنیں اس پر پڑتے ہی بازیابی ہو جاتی ہے اسی بازار میں سینکڑوں اور بھی لوگ ہوں گے لیکن خالی ہاتھ کو نوازا نہیں جاتا۔ میں یہ نہیں کہتا کرم کے لئے کوئی اصول ہے لیکن جس کے ہاتھ میں منقش ظرف ہو گا...... توفیق کی کرن پڑتے ہی وہ جگمگائے گا اور سرفرازی ضرور ہو گی...... اس عہد میں یہ ظرف میں نے صرف شہاب صاحب کے پاس دیکھا ہے......"

جتنی دیر میں ہسپتال رہی صاحب دعا کی توجہ مجھ پر رہی ڈاکٹروں کی محبت، اجنبی لوگوں کے خون کے عطیے دور دراز سے دعائیں شعاعیں بن کر مجھ پر پڑتی رہیں۔ اسی بیماری کے دوران شہاب بھائی نے میرے لئے دعائے "کن فیکون" پڑھی۔ جب میں پوری طرح سے بوریا بستر باندھ کر اپنے ستارے کی طرف لوٹ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ صاحب دعا نے خاموشی سے میرا راستہ روک لیا...... اور فطرت کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا اس بیماری سے شفایاب ہو کر جب میں گھر پہنچی تو ایک بار پھر پریشان تھی۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر شہاب بھائی سے خط میں کیا۔

خط میں ارشاد ہوا......

"یہ جو آپ سمجھتی ہیں کہ موجودہ مہلت شاید بیکار جائے کیونکہ ہسپتال والی کیفیت اور احساس اب گھر آ کر دنیاداری کے نرغے میں باقی نہیں رہا۔ یہ درست نہیں۔ جس طرح کوئی پھل جب ایک بار پک جائے تو اسے کسی طرح بھی واپس کچا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی Sense of detachment کو رفتہ رفتہ بڑھاتے رہنا چاہئے۔ جسمانی معذوری تو بیماری کے حملے نے عطا کر ہی دی ہے۔ اس لئے گھر کے جملہ کام کاج سے ہاتھ اٹھانا آپ کا حق ہے زیادہ تر کام دوسروں پر چھوڑیں۔ ٹھیک ہوتے ہیں تو زیادہ خوش نہ ہوں۔ نہیں ٹھیک ہوتے تو ہرگز نہ کڑھیں۔ جس ڈھب پر یہ کام ہوں گے اسی ڈھب پر باقی سب کا life style خود بخود adjust ہوتا رہے گا۔ آپ اپنی توجہ زیادہ تر ذکر، فکر اور لکھنے پڑھنے میں لگائیں۔

اشفاق سے کہیں کہ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ قرآن آپ کو لا دے۔ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے ہر روز پڑھیں ترجمے کے ساتھ۔ ایک بار ختم ہو جائے (خواہ کتنی دیر ہی کیوں نہ لگے) تو دوبارہ شروع کر دیں۔ قرآن کا پڑھنا پیاز چھیلنے کے مترادف ہے۔ جتنی بار پڑھا جائے اتنی ہی بار معنی کے چھلکے اترتے جاتے ہیں۔ معنی سمجھنے میں زیادہ تحقیق میں نہ پڑھیں۔ جتنا سمجھ میں آئے کافی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ سمجھ بھی وسیع اور گہری ہوتی جائے گی۔ البتہ یہ خیال رہے کہ جو literal معنی ہیں وہی بلاچون وچرا قابل یقین ہیں۔ اس شغل پر کچھ محنت صرف کی جائے تو detachment کی راہ خود بخود ہموار ہو جاتی ہے......

اشفاق سے بھی کہیں کہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ بھی اس شغل کو تھوڑا تھوڑا اپنانے کی کوشش کرے......"

میں نے جو کچھ شہاب بھائی سے پوچھا ویسا ہی سوال شیما مجید نے بھی کیا تھا کہ

کون اللہ کے فضل کا حقدار ہے یہ لاٹری کیسے نکلتی ہے؟ اس کے متعلق ایک بار شہاب بھائی نے شیما مجید کو بھی خط لکھا تھا۔

اسلام آباد

۱۸ر دسمبر ۱۹۸۲ء

محترمہ عزیزہ شیما مجید صاحبہ

آپ نے پوچھا ہے کہ جو علوم محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتے ہیں ، انسان کو ان کا امیدوار کیسے رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ لاٹری کیسے نکالتا ہے؟ اور اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا ہے؟

اللہ کے فضل کا حقدار تو کوئی نہیں کہلاتا۔ لیکن امیدوار سب کو اس طرح رہنا چاہئے جس طرح لاٹری کا ٹکٹ لے کر یقین تو کسی کو نہیں ہوتا لیکن گمان سب کو رہتا ہے کہ شاید میرا نمبر ہی نکل آئے۔ لاٹری کی تشبیہ کو ذرا کھینچ کر بات مزید صاف ہو جاتی ہے۔ لاٹری کا انعام نکلنے کی امید اسی کو ہو سکتی ہے جس نے لاٹری کا ٹکٹ لیا ہو۔ جس نے ٹکٹ ہی نہ لیا ہو وہ اگر انعام کی توقع لگا کر بیٹھ جائے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اللہ کے فضل کی لاٹری کا ٹکٹ اللہ کی عبادت اور معرفت ہے۔ جو لوگ یہ ٹکٹ حاصل کر لیتے ہیں ان کے فضل کو لاٹری کے انعام کی امید لگانے کا حق پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل کی لاٹری کیسے نکالتا ہے اس کا علم تو فقط اسی کی ذات کو ہے۔

اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا ہے ' ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد درجہ اور مقام کے مطابق اپنے علوم کا پیمانہ خود بخود اپنے آپ پر منکشف ہوتا رہتا ہے اس کے اپنے نور باطن سے ایسی چیزیں اور باتیں معلوم اور محسوس ہونے لگتی ہیں جو نہ دوسروں کو معلوم اور محسوس ہوتی ہیں اور نہ دوسرے عام ذرائع سے معلوم اور محسوس ہو سکتی ہیں۔ اگر کبھی ایسی کیفیت وارد ہو تو اسے ہر کس و ناکس پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر کسی سے باطنی اور روحانی تعلیم و تربیت کا رشتہ قائم ہو تو اس سے ہرگز چھپانا نہیں چاہئے کیونکہ کبھی کبھی ایسی واردات تصوراتی ہوتی ہیں یا متخلیہ کی کرشمہ سازی ہوتی ہیں اور انسان انہیں نور باطن سمجھ کر گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے......

حقیر

قدرت اللہ شہاب

عبادت کے سلسلے میں بھی شہاب بھائی نے شیما مجید کو خط لکھے تھے۔

مری

۶ر جون ۸۴ء

محترم عزیزہ شیما مجید

عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے کی جائے اسی عبادت میں اصلی خلوص پیدا ہونے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے اس کے علاوہ جو عبادت ذاتی ' یا دنیاوی یا دیگر مقاصد یا مرادوں کو پورا کرنے کی غرض سے کی جائے اس میں خلوص پورا نہیں ہوتا......

حقیر

قدرت اللہ شہاب

پھر ایک اور خط میں اسی مضمون پر فرمایا

اسلام آباد

۲۳ر ستمبر ۸۴ء

محترمہ عزیزہ شیما مجید

ا سلام علیکم

ڈاکٹر اجمل نے مولانا اشرف علی کے حوالے سے شخصی دعا کے متعلق جو لکھا ہے وہ میں نے نہیں پڑھا۔ البتہ شخصی دعا سے غالباً یہی مقصد ہو گا کہ انسان براہ راست اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خضوع و خشوع سے اپنی فریاد کرے ' ایسا کرنے میں کسی خاص صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے یکساں کھلا ہے ہاں جو لوگ عام طور پر اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے کے خوگر ہیں انہیں باری تعالیٰ کے ساتھ شخصی رابطہ استوار کرنے میں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی دوسروں کو کسی قدر ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہو گی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے راستہ سب کے لئے کھلا ہے......

دعاگو

قدرت اللہ شہاب

شہاب بھائی وارفتگی کے آدمی نہیں تھے وہ جذبات کو عین معمول پر لانے کی کوشش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی خوبی ہی بعض اوقات اس کی خرابی 'اور اس کی خرابی ہی بیشتر نجات کا باعث بن جاتی ہے۔ سخی انسان گو دنیا میں قابل تعریف شخصیت ہے لیکن یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سخی کی بیٹی غلط راستے پر پڑی اور اس کا بیٹا مانگنے پر مجبور ہوا اور ذلت کی زندگی گزارنے لگا۔ چور اپنے اعمال کو دیکھ کر استغفار کی سیڑھی پر چڑھ گیا اور قطب کہلایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جس قدر اپنی کوتاہیوں 'خرابیوں پر پشیمان ہونے کی ضرورت ہے اتنا ہی اپنی بھلی عادتوں 'نیک خصلتوں اور خوبیوں سے بچنے کی بھی ضرورت ہے۔ اپنی خوبی کا احساس کئی بار تکبر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور تکبر ایک ایسی آگ ہے جس میں اچھائی برائی سب بھسم ہو جاتی ہے۔ بس حیا اور عجز دو اچھے وصف ہیں یہ ساتھ ہوں تو نہ اچھائی تکبر بنتی ہے نہ برائی لے ڈوبتی ہے **اور ان کے اس وصف کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ اچھائی ہے کہ برائی۔**

جب یہ چھوٹے تھے تو خان صاحب کے لئے لاہور کے قلعے سے ایک شخص مہاتما بدھ کا چھوٹا سا مجسمہ لایا' یہ مورتی صرف مہاتما کے سر کی تھی۔ میں نے یہ مجسمہ بچوں کے کمرے میں کھڑکی میں رکھ دیا۔ کبھی کبھی جب انیق خاں گہری نیند سویا ہوتا۔ تو مجھے نیم اندھیرے میں اس مجسّمے اور اس کی صورت میں بڑی مشابہت نظر آتی...... مجھے خوف رہنے لگا کہ راجہ گوپی چند کی طرح ایک دن میرا یہ بیٹا کہیں کسی برگد تلے نہ جا بیٹھے۔ آپ جانتے ہیں ہر عورت سوتن سے کہیں زیادہ چھپے ہوئے رب کی کشش سے ڈرتی ہے جو اس کے پیاروں کے کان پھڑوا کر ہاتھ میں کاسہ پکڑاتا اور کانٹوں کا تاج پہناتا ہے ایسے میں ماں کے دل پر جو بیت جاتی ہے اس کا کسی ولی اور قطب کو گمان بھی نہیں ہو سکتا...... اسی مشابہت سے خوفزدہ ہو کر میں نے پہلے انیق کو ٹینس کھیلنے پر لگایا۔ پھر ہارمونیم کے ساتھ گانے کے لئے ابھارا...... طبلہ سکھانے کے لئے ماسٹر لگایا اور بھانت بھانت کے مشغلے اس کے اردگرد بکھیر دیئے...... لیکن انیق کے چہرے پر پھیلی ہوئی محبت بھری شانتی میں خوف کی کمی نہ آئی...... پھر وہ کچھ بڑا ہوا اور انگریزی میں نظمیں لکھنے لگا تو میں اور بھی خوفزدہ ہو گئی جب تک اندر راجہ گدھ لہو نہ چوستا ہو ادب تخلیق نہیں ہو سکتا...... میں نے اسے ادب کی پٹڑی سے اتار کر سکرپٹ رائٹر بنانا چاہا لیکن وہ اپنے والدین کی شہرت دیکھ کر اور اس سے جنم لینے والے مسائل سے خوفزدہ ہو کر اس دشت کی پہنائی میں اترنا نہیں چاہتا تھا...... انیق خاں ان دعوت ناموں کو پسند کرتا جو تواتر سے ہمارے گھر آتے ان ایوارڈوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا جو ہمیں ملتے لیکن کیمروں کی روشنیاں' بڑی بڑی محفلوں میں خود پسندی اور خود آرائی کی باتیں' اپنے آپ کو تانتیا توپی سمجھ کر دوسروں کو گندی مکھی بنانے کا فن' بڑی عمر کے سیلف میڈ آدمیوں کی فرعونیت انیق کو ناپسند ہے۔ وہ اندر ہی اندر گمنامی' شانتی' خاموشی' دوسروں کے لئے بے ضرر رہنے کو پسند کرتا ہے۔ اسے بڑی محفلیں' اونچے بیان' بڑی عمر کے مرد بہت گڑبڑا دیتے تھے......

پھر ایک روز یوں ہوا

انیق احمد خاں ایف سی کالج میں سائیکولوجی پڑھانے لگے۔ چونکہ ہمارے گھرانے میں تمام کام جوش، ولولے، اور درستی سے کرنے کا رواج ہے۔ اس لئے وہ بھی دنیا و دین چھوڑ کر صرف شاگردوں کی زبان سمجھتا تھا۔ ان دنوں طائف میں مقیم ایک سائیکولوجسٹ لاہور آئے ہوئے تھے۔ ان سے انیق خاں ملا تو معلوم ہوا کہ طائف میں قرآنی آیات کے ساتھ ذہنی بیماریوں کا علاج کیا جا رہا ہے اور اسی ضمن میں سائیکیاٹری کی ایک انوکھی برانچ وہاں کھل گئی ہے۔ انیق خاں بھی چمکتی آنکھیں اور ولولہ انگیز پلانوں کے ساتھ گھر لوٹے...... ان کا خیال تھا کہ وہ بھی طائف جائیں اور ذہنی ابتلا میں مبتلا کا علاج اسی طور پر کریں۔ شہاب بھائی کریپ سول کے جوتے پہننے میں مشغول تھے...... انیق خاں کی بنائی ہوئی چھڑی ان کے پاس دھری تھی وہ بڑی توجہ سے بظاہر ان سنے انداز میں انیق خاں کی باتیں سنتے رہے۔ ایک بار بھی انہوں نے ان پرجوش باتوں پر ٹھنڈا چھینٹا نہ مارا...... بالآخر انیق خاں نے پوچھا......

"شہاب چچا کیا واقعی ایسے ممکن ہے؟ کیا قرآنی آیات سے علاج ہو جاتا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں...... بالکل ہو جاتا ہے۔"

"تو کیا میں طائف چلا جاؤں؟...... ایک بڑے مشن میں شامل ہو جاؤں......؟"

شہاب بھائی بڑی دیر چپ رہے جیسے اپنے مشورے کی نیچر کو آنک رہے ہوں پھر بولے......

"میرا تو خیال ہے تمہیں نہیں جانا چاہئے کیونکہ یہ قرآنی آیات کا صحیح استعمال نہیں۔ قرآن دراصل روح کے سفر کے لئے ہے۔ دنیا بھی ساتھ ساتھ سنورتی ہے۔ لیکن اسے کسی صورت بھی کمرشل و نیچر سے وابستہ نہیں ہونا چاہئے"۔

وہ جانتے تھے کہ عام انسان کا ایمان کمزور ہوتا ہے اگر کسی دن...... کسی وجہ سے کسی آیت سے علاج نہ ہو سکا تو عین ممکن ہے کمزور ایمان والے کا زیادہ ہی نقصان ہو جائے لیکن ڈھیلی سی آواز میں بغیر اصرار کے شہاب بھائی نے جو مشورہ دیا انیق خاں نے اس پر عمل کیا اور طائف نہ گئے۔

یوں تو میرے تینوں بچے وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی وہ بند کمرے میں شہاب بھائی سے کچھ ڈھکی چھپی باتیں بھی کرنے جاتے جن کا سراغ ہمیں کبھی نہ ملتا...... شہاب بھائی کے جانے کے قریباً سال بھر بعد ایک دن انیق خاں نے بتایا۔

"میری شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ غزل اور میں بالکل مختلف ماحول کی پیداوار ہیں۔ ہمارے خاندانی کلچر ایک سے نہ تھے۔ اس کی سوچ اور میری سوچ میں بڑا ہی بُعد تھا۔ اسی کشمکش میں ایک روز میں شہاب چچا کے پاس گیا اور لجاجت سے عرض کی کہ یہ گاڑی مجھ سے تو چلتی نہیں آپ بتائیں کیا کریں"۔

ارشاد ہوا.........

"شادی کے چند ابتدائی سالوں میں Teething troubles ہوتی ہیں۔ دو مختلف انسان ملتے ہیں نہ

ایک اچھا ہوتا نہ دوسرا برا...... بس دونوں مختلف ہوتے ہیں۔ مختلف گھروں کی پیداوار اور آہستہ آہستہ جس طرح بچہ دانت نکلنے پر سخت سے سخت چیز کھانے لگتا ہے ایسے ہی میاں بیوی چند ابتدائی سالوں کے بعد مشکل مقامات پر بڑے تھوڑے رد عمل کے ساتھ عبور پا لیتے ہیں......"

انیق خاں نہ صرف کمرے سے خوش نکلا بلکہ شادی کی ابتدائی تکلیفوں سے **نلوہ** بچ گیا اور خوشی خوشی شادی بتانے لگا۔

جس وقت شہاب بھائی کا وصال ہوا۔ انیق خاں پاکستان میں نہ تھا واپسی پر جب انہیں سارے واقعات غزل نے سنائے تو انیق خاں خاموش ہو گئے بڑی دیر بعد بولے......

"شہاب چچا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا پہلے بیعت نہ کرنے دی۔ پھر اب جبکہ ان کی ضرورت اتنی زیادہ تھی ہمیں یوں چھوڑ کر چلے گئے"...... اس کے بعد انیق خاں کئی دن کرسیوں پر، قالین پر، اپنے کمرے میں، برآمدے میں، پلنگ پر ڈھیر سا بیٹھا نظر آتا جیسے وہ اندر ہی اندر کسی جگ سو پزل کو دوبارہ تشکیل دینے میں مشغول تھا۔ پھر ایک روز ایک نظم اس کے پلنگ کے پاس تپائی پر پڑی نظر آئی، میں جلدی میں تھی پڑھ کر محفوظ نہ کر سکی۔ ہوا میں اڑی چند دن دروازے کے پاس کونے میں رہی۔ جھاڑو کے ساتھ مہندرو نے اسے کمرہ بدر کرنا چاہا۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھا لکھا تھا۔

شاید کل ہی اچھی گزرے
شاید موسم اچھا ہو
شاید دھند کے پردے میں سے
چڑھتا سورج پورا ہو
شاید بے کل، کل نہ ہووے
شاید رستہ چھوٹا ہو
شاید باغ دریچے میں اک
جانا جانا چہرہ ہو
شاید رت رنگیں ہو جائے
شاید بادل چھایا ہو
شاید میرے شور کے اندر
اک سناٹا غالب ہو
شاید سب کو واہمہ گزرے

شاید پاگل راضی ہو
شاید خود سے باتیں کر کے
اپنا خواب ہی سچا ہو

شہاب بھائی کے جانے کے بعد آنے والی کل کا خوف پھر اس پر غالب آ گیا تھا۔ انیس خاں آنے والی کل سے خوفزدہ نہیں ..... گزری ہوئی کل کا زخم خوردہ ہے۔ غل غپاڑہ مچاتی، چپ چپیتی گزرتی، ہنستی کھیلتی، اداسی نراسی، بدلی کی طرح سبک، آندھی جیسی شہ زور، ڈالیاں ہلاتی، گرد اڑاتی ہر گزری ہوئی کل اپنا سارا موڈ، آوازیں، رنگ ایک پورا پروگرام مونیٹر کر کے انیس کے اندر چھوڑ جاتی ہے۔ پھر وہ آنے والی کل کی بند مٹھی کو نہیں دیکھتا.... للاری کی طرح ان دھوئے ان چھوئے سفید دوپٹے کو گزرے ہوئے رنگوں میں رنگنے لگتا ہے۔ مونیٹر شدہ پروگرام اسے بے خوفی سے آنے والی کل کا سواگت ہی کرنے نہیں دیتا.....

وہ لمبے چوڑے شکوے شکائتیں، چھوٹی چھوٹی فردعی باتیں بڑے شوق سے کرتا ہے لیکن خان صاحب کی طرح اصلی بات کو چھوٹی بڑی باتوں تلے چھپائے رکھتا ہے۔ تورخم پہاڑ کے چٹیل سینے پر بغیر بندوق کے چلنے والا انیس خاں ان ساعتوں کی نگرانی کرتا ہے جن میں کبھی اسے خوشی ملی۔ خوف جیسے دشمن سے وہ ان چینگی پوٹوں کو چھپانا اپنا فرض بھی سمجھتا ہے۔ اس میں اپنے باپ دادا کی روحیں رہتی ہیں۔ جو بڑی بغیرت سے زندگی بسر کرتی ہیں، اور غیرت کو ڈھال بنا کر آگے بڑھتی رہتی ہیں۔

وہ مذاق کرتا ہے لیکن شوخ چشم نہیں......

وہ پیاروں کی نگرانی کرتا ہے لیکن اظہار سے خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں یہی اظہار ہتھیار بن کر اس کے خلاف استعمال نہ ہو.....

وہ قریب آنا چاہتا ہے لیکن پاس آ کر یخ بستہ ہو جاتا ہے کیونکہ پذیرائی کا شوق پہلے ہی خوف نے کند کر رکھا ہے۔ انیق خاں کے خوف ان جانے، ان دیکھے Fear of the unknown سے لرزتے ہیں انیس خاں کا خوف جانے پہچانے، کیٹلاگ میں درج، ٹیپ شدہ، سمری کی شکل میں تیار پہلے سے ہی لال بتی جلانے والے ہوتے ہیں اور ہمیشہ اسے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہیں۔ دونوں وقت کے دھارے پر تھر تھر کانپتے بادبانوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں احتیاط سے قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ اور اپنی کسی غلطی کو معاف نہیں کرتے ایک دفعہ یوں ہوا..........

رات کا وقت تھا۔ انیس خاں پچھلے سی بلاک میں سائیکل پر سوار بیٹری کے سیل خریدنے گئے کچھ دیر کے بعد بغلی گلی میں دھڑام سے سائیکل گرنے کی آواز آئی۔ ہم سب باہر لان میں بیٹھے تھے۔ اس شور پر سب کے کان

کھڑے ہو گئے۔ اب انیس خان بھاگا ہوا آیا۔ اس وقت وہ نوبالغ تھا۔ آتے ہی اس نے کہا...... "میں سی بلاک کے بڑے رستے سے آرہا تھا کہ کچھ لوگ عجیب وغریب لباس پہنے مجھے ڈرانے آئے...... میں میں...... میں" اس کا چہرہ ہراس سے زرد تھا...... اس کی آواز میں لغزش تھی وہ اپنا تجربہ پورے کا پورا بیان کرنے سے قاصر تھا۔ میں اسے تسلی دینا چاہتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا وہ ایسے لمحات میں ہمدردی کو قبول نہیں کر سکتا۔ وہ دہشت کے نرغے میں تھا لیکن اس کے ساتھ ہمدردی کرنا بھی ممکن نہ تھا......

اب انیس رات رات جاگنے لگا وہ دوسری منزل میں ریکارڈنگ روم کے اندر تین تین بجے تک بیٹھا رہتا۔ سگرٹیں پیتا اور خوفزدہ رہتا...... میں اوپر جانے والی سیڑھیوں تک جاتی چوری چوری ادھ کھلے دروازے میں سے سگریٹ کے دھوئیں کو دیکھتی۔ اس کا خوف عبادت کی طرح مقدس تھا۔ مخل ہونے کی گنجائش نہ تھی......

جب اس کی شادی کی بات چلی اور ہمارے گھر میں ہر گھر کی طرح جھگڑے پڑے تو میں اس کی رائے بھی معلوم نہ کر سکی۔ خاں صاحب اس رشتے پر رضامند نہ تھے اور مجھے یہ خوف تھا کہ انیس اس درجہ خوفزدہ ہے کہ اپنی اصلی خواہش کا کبھی بھی اظہار نہ کرے گا......

پھر یوں ہوا......

اسلام آباد میں شہاب بھائی پیلی فورڈ چلا رہے تھے مفتی جی میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر اور سامنے خان صاحب شہاب بھائی کی بغلی نشست پر بیٹھے تھے...... سڑک کے کنارے ایک پھل والے کی دوکان پر رک کر خان صاحب اور شہاب بھائی پھل خریدنے اتر گئے۔ مفتی جی بولے "قدسو۔ جب کبھی شہاب پھل کی دوکان پر میرے ساتھ جاتا ہے میں اسے ضرور اپنے لئے پھل خریدنے کو کہتا ہوں۔ تم بھی اس سے مانگا کرو...... مانگو...... مانگو...... برکت ملتی ہے......"

برکت اور مانگنے پر بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر مفتی جی بولے...... "اوئے تم اندھے ہو ثویلہ اور انیس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟......"

میں چپ رہی

"میں جانتا ہوں وہ تیرا پٹھان نہیں مانتا...... اور دوسرا انیس پٹھان اتنا خوفزدہ ہے کہ وہ اظہار نہیں کرتا لیکن اس سے بہتر لڑکی کہاں ملے گی؟"

میں پھر بھی چپ رہی......

"اچھا میری نہ مان...... شہاب سے بات کر......"

میں شہاب بھائی کے پاس گئی دوزانو بیٹھی لیکن مجھے کچھ کہنا نہیں پڑا......

نہ رشتے کے سلسلے میں نہ خان کی نارضامندی کے بارے میں نہ انیس خاں کی سفارش کے ضمن میں۔

ارشاد ہوا......

"خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں سب کچھ اللہ کی رضا پر چھوڑ دیں۔ آپ دیکھیں گی ہر صورت میں وہی ہوگا جو آپ چاہتی ہیں......"

"آپ دعا کریں؟" میں نے لجاجت سے کہا "ہاں میں دعا کروں گا" میں نے ان کی دعا کے بعد اللہ کی رضا پر کچھ نہ چھوڑا' اور وہی ہوا جو میں چاہتی تھی۔

دراصل شہاب بھائی ایسا پنڈولم تھے جو ہمیشہ درمیان میں رہتا ہے۔ ان کے ارد گرد سب شدت پسند تھے کبھی دائیں کبھی بائیں...... لیکن وہ عین وسط میں رہتے تھے۔

ان کے دوست رشتہ دار سب ان کاسٹ تھے لیکن ان شدتوں کی وجہ سے انہوں نے کبھی کسی کو نہیں چھوڑا کسی کو نہیں ٹوکا کوئی نصیحت نہیں کی بلکہ صرف یہی امید رکھی...... "اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا......"

وہ کہا کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی دنیا میں ہوتے ہیں۔ جن کا Wishing ہی Willing ہوتا ہے۔ ایسے ہی کچھ لوگوں میں ان کا شمار بھی تھا۔ جب وہ نیک نیتی سے آپ کے لئے دعا کر دیتے تو آپ کا کام فوراً ہو جاتا۔ ان کی دعا سے ایسے ہی انیس اور ثویلہ کا کام بن گیا۔ اب انیس خاں اس نکاح نامے کی بہت حفاظت کرتا ہے جس پر کیو۔ یو۔ شہاب کے دستخط ہیں۔ وہ کچھ کو بتاتا تو نہیں لیکن اس کا خیال یہی ہے کہ بابے ہی اس کی کشتی کھے رہے ہیں۔ بابے ہی اس کے ہم سفر ہیں۔ بابے ہی درپردہ اس کی بگڑیاں بناتے ہیں۔ اگر بابے اس کے ساتھ نہ ہوتے تو اب تک خوف کے بگولے نہ جانے اسے کہاں اڑا لے جاتے...... جیسے کئی سال اس کے چھوٹے بھائی اثیر کو خوف کا گھمبیرا بھگائے لئے پھرتا رہا......

خواہشوں کی رسہ کشی عموماً لوگوں کو ایسے پیروں کی طرف لے جاتی ہے جو گنڈے تعویز سے عمل اور دعا سے خواہش پوری کرنا جانتے ہیں...... خواہشات کے حصول کے لئے پیر پکڑنا اور بالآخر ایسے پیر کو جو تلاش حق میں ابھی خود کمزور ہو ڈبہ پیر بنا کر لوگوں کا ضرورت مند بنا دینا ایسے ہی خواہش مند لوگوں کا کرشمہ ہے...... جس طرح خواہش کا اتباع دنیا میں کرپشن کے دروازے کھولتا ہے ایسے ہی مقدمہ' محبوب کی واپسی' بیٹے کی نوکری' شوہر کا موت سے چھٹکارا' امتحانوں میں کامیابی' دشمن زیر پا' قرضے سے نجات' حصول دولت وغیرہ جب طاقت' روپے' رشوت' سفارش سے اپنے اختیار میں نہ آسکیں تو عام دنیادار پیر کے دروازے پر پہنچتا ہے لیکن وہ اپنی کرپشن ساتھ لے کر جاتا ہے اب پیر پر دولت' نذرانے' خدمت کا اثر ہونے لگتا ہے۔ خواہش پوری ہو نہ ہو...... کرپشن ضرور اثر دکھاتی ہے۔

کچھ لوگ حصول علم کی خاطر پیروں کی چلمیں بھرتے ہیں ان کی عقل ان کو ہراساں رکھتی ہے وہ "جاننا" چاہتے ہیں۔ دین ان کے لئے جیومیٹری' الجبرے کا سوال ہے جس کا حل ہونا ضروری ہے۔ وہ قائل کرنے اور قائل ہونے کے لئے بابوں کے پاس جاتے ہیں۔ ذہین' پر مغز باتیں ان کی عقل کو خیرہ کرتی ہیں۔ کسی بزرگ سے دین کا علم اخذ کرنا اور پھر اسے دوسرے کم علم کمزور لوگوں پر لاٹھی' رسی' چوب' ہتھکڑی' زنجیر'

بندوق کے طور پر استعمال کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ کسی بابے سے چرایا ہوا علم عام آدمی کو دانشوری کی ایک جداگانہ سند عطا کرتا ہے۔ اس Seat of learning کے سہارے نہ صرف وہ اپنی کرسی اونچی کر سکتا ہے بلکہ دوسروں کے پائے بھی کاٹ سکتا ہے......

چند ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی نے پذیرائی نہیں کی ہوتی۔ وہ جہاں کہیں بھی جائیں گے گول سوراخ میں چوکور میخ بن کر وقت گزاریں گے۔ کسی کو ان کی کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔ کوئی ان کی خاطر نہ انتظار کرتا ہے نہ آنسو بہاتا ہے۔ انہیں پیروں کے کتورے بننے میں ایک خاص قسم کی لذت ملتی ہے۔ تنہا سے خدا والے ہوجانا...... کسی کو بھی belong نہ کر سکنے کی اذیت سے نکل کر وہ ساری خدائی کو own کرنے لگتے ہیں۔ ایسے تنہا تنہا اداس اداس چہرے ڈیروں پر بڑے فعال ہوتے ہیں اور سب کو لنگر کھلاتے ہیں چٹائیاں بچھاتے ہیں۔ لوٹے بدھنیاں قطار میں لگاتے ہیں...... نلکوں پر لمبی ٹاکیاں باندھتے ہیں تاکہ پانی کے چھینٹے نہ اڑیں۔ جوتیاں قطاروں میں آراستہ کرتے ہیں اور ڈیرے پر ان کی اہمیت دن بہ دن بڑھتی جاتی ہے اور کم مائیگی کم ہونے لگتی ہے۔

کچھ لوگ "ہیرو ورشپ" کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ صاحب کمال لوگوں کے پیچھے چلنے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ نامور موسیقار، اچھے ادیب، قابل ڈاکٹر، رواں خطیب، بلکہ یوں سمجھئے کہ اپنے سے بہتر انسان کی ایک جھلکی دیکھ کر یہ لوگ اس کی بڑائی کی نہ صرف تعریف کرتے ہیں بلکہ ایک طرح اسی کی بڑائی کو Simulate کر کے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً اپنی خواہشات، ان کے حصول اور بعد کی مایوسی سے تنگ آکر اللہ کے نیک بندوں کے حضور بیٹھے رہتے ہیں۔ انہیں یہ بات تحیر میں لے جاتی ہے کہ خواہشات کے بازار میں سے گزرتے ہوئے فقیر لوگ کیسے خواہشات کے دباؤ سے آزاد رہتے ہیں؟ عورتیں عام طور پر بھگت کے آشرم، فقیر کے ڈیرے، گیروے کپڑے والے سنیاسی کے حضور، ہرے چوغے میں ملبوس دریوزہ گر کے سامنے بڑی عاجزی سے حاضری دیتی ہیں۔ دنیا چونکہ عورت کے بغیر چلتی نہیں اور یہ عارف دنیا آخری سانس تک کسی نہ کسی بچے پوتے کے لئے دنیا ہی مانگتی رہتی ہے اس لئے ڈیروں پر جا کر عورت غیر شعوری طور پر تحیر میں چلی جاتی ہے۔ یہاں سے "ہیرو ورشپ" کا مکمل چانس ملتا ہے۔ آرزوؤں سے لدی پھندی وہ خواہشات کے پھل پتے جھڑے درخت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے...... پھر جس رقت، عاجزی حیرانی سے عورت ہیرو ورشپ کرتی ہے کبھی کبھی اس جذبے سے بھگت کے تنبو کی ساری طنابیں اکھڑ جاتی ہیں، اور وہ عارف مولیٰ نہیں رہتا...... گرہست آشرم میں قدم دھر کر آہستہ آہستہ عارف دنیا بن جاتا ہے۔ اللہ اپنے پیاروں کو عورت سے اس لئے نہیں بچاتا کہ خدانخواستہ وہ جیلس ہے یا وہ مرد عورت کی محبت کو اپنے لئے خطرہ سمجھتا ہے بلکہ خدا وجود کے گناہ سے اپنے فقیر کو فقط اس لئے بچاتا ہے کہ ایک بار عورت کا ساتھ ہو جائے تو پھر ہر مرد گھونسلا! بنانے، کھڑکیاں دروازے رکھنے، سودا سلف لانے پر مجبور ہے...... عورت کا کفیل ہو کر وہ اللہ کا آزاد پنچھی

نہیں رہ سکتا...... دنیا کا رخ کرتے ہی بسیط فضاؤں میں اڑنا ممکن نہیں رہتا...... بھگت ایک کھونٹے سے بندھ کر چھوٹے چھوٹے ناخنوں سے گھاس کھودتا رہتا ہے اور آزاد پرندوں کی طرح اڑنا بھول جاتا ہے............

عرفان ذات اور عرفان حق کا مسئلہ بھی کچھ لوگوں کو درپیش رہتا ہے............

ان کے اندر کچھ سوالات کیڑوں کی طرح کربل کربل کرتے ہیں۔ وہ اپنے وجود سے لے کر اللہ کی ذات تک سمجھی اور ناسمجھی کے الاؤ میں جلتے ہیں۔ کبھی وہ دانشوروں کے گروہ میں بھٹکتے ہیں۔ کبھی کتاب ان کا آستانہ بن جاتی ہے اور کبھی وہ صاحب عرفان کی دہلیز پر جا بیٹھتے ہیں۔ اگر کچھ مسئلوں کا شافی جواب مل بھی جائے تو کچھ اور زمیں دوز مسئلے سر اٹھا لیتے ہیں۔ اس طرح پہلی لو گھٹتے ہی دوسری لو کا انتظار شروع ہو جاتا ہے...... یہ لوگ کئی پیر، کئی آستانے، کئی ڈیرے، کئی بابے اور کئی کیفیتوں کی الجھنوں سے نکل کر بھی سوالوں میں گھرے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر تحقیق کے بغیر جاننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں کہ جتنے نفس پیدا ہوتے ہیں اتنے ہی راستے اللہ کی جانب نکلتے ہیں۔ جس قدر ڈھونڈنے والوں کی قسمیں ہیں اتنی ہی راستہ دکھانے والوں کی بھی ہیں۔ کچھ لوگوں نے آسانی کے لئے پیروں کو جمالی اور جلالی کے دو طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے لیکن مزاج کے اعتبار سے یا مسلک کے حساب سے پیر کو کسی بریکٹ میں بند نہیں کیا جاسکتا۔

کچھ فقیر جوانی میں عشق مجازی کی ٹھوکر کھا کر ایسے دل برداشتہ ہوتے ہیں کہ پھر انہیں ساری دنیا ٹھکرا کر ایک اللہ کی ذات کا تکیہ رہ جاتا ہے۔ ایسے بھگت عموماً جمالی ہوتے ہیں۔ شہروں سے باہر اجاڑ میں رہتے اور فطرت سے پیار کرتے ہیں۔ ان کے ڈیروں پر ڈنگر، کتے، بلیاں ہوتی ہیں۔ اگر ڈیرہ منظور نہ کریں تو پھر یہ نگری نگری پھرتے ہیں جو ملا سو کھا گزرے نہ ملا تو پڑ رہے۔ ایک بار مانگ کر ایسے تجربے سے گزر چکتے ہیں کہ پھر مانگنے کا تجربہ نہیں دوہراتے۔ ان کی واحد محبت پھیل کر سمندر کی لہروں جیسی دور دور تک دائرے بناتی جاتی ہے۔ مخلوق ان کی تلاش میں بالکل ویسے رہتی ہے جیسے یہ کبھی اپنے مجازی محبوب کے دیدار کے لئے دیوانہ وار پھرتے تھے۔ یہ محبت کا ایک بڑا گرڈ سٹیشن بن جاتے ہیں جس سے کئی علاقے کئی بستیاں روشن ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں سے راضی برضا رہنے کی خوشبو آتی ہے۔ ان کے چلنے پھرنے میں عاجزی عبادت میں اللہ سے وصل کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ خلق سے چھپ کر بسرام کرنا چاہتے ہیں مگر لوگ انہیں ڈھونڈ نکالتے ہیں پھر حُب کے تعویز، بانجھ عورت کا علاج، بچھڑے دوست کی واپسی، گمشدہ بیٹے کی تلاش کے لئے ان کا کہا تیر بہدف مانا جاتا ہے...... اپنی اکلوتی خواہش کا بلیدان دے کر یہ خواہشات کے حصول کا راستہ بن جاتے ہیں۔ ان کی مجبوری دوسروں کی سرفرازی بن جاتی ہے۔

کچھ اللہ کے پیارے اپنے نفس کی تادیب کرتے کرتے، احکامات کی پیروی، کڑی کاوش اور بہت وظیفے وظائف سے دن رات بسر کرتے ہیں۔ مٹھی بھر جو کھا کر چلو بھر تا پانی پی کر برس ہا برس گزارتے ہیں۔ ایسے

بزرگوں میں کبھی کبھی وہ چور بھی ہوتے ہیں جو قطب کے درجے کو پہنچتے ہیں۔ احساس جرم کی تاب نہ لاکر سیدھا کھڑے رہنے والا فقیر روحانی دنیا کا بڑا ہی طاقتور پہلوان ہوتا ہے' ان کی طبیعت عموماً جلالی اور دینے کا انداز بادشاہوں کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی سلام کئے جانے پر رنجیدہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات گالی دینے پر خلعت بخش دیتے ہیں۔ یہ جن کو پتھر اینٹ مار دیں جانئے وہ پار ہو گیا جس کو تھپڑ جھانپڑ پڑ گئی' اس کی خواہش ٹھکانے لگی۔ جس طرح پہلوان کا کسرتی جسم طاقت میں عام آدمی سے زیادہ ہوتا ہے ایسے ہی ان کے روحانی ڈولے بڑے بڑے کارنامے کرتے ہیں ان کی بد دعا' سنا ہے' دعا سے بھی زیادہ سریع التاثیر ہوتی ہے۔

کچھ فقیروں کو ابھی آدھی آنچ کی کسر ہوتی ہے وہ کلی طور پر اپنی خواہشات پر ڈھکنا لگانے کا فن نہیں جانتے۔ ان کا نفس رسی سے ضرور بندھا ہوتا ہے لیکن رسی پورے شہر برابر لمبی ہوتی ہے۔ ایسے فقیروں کا تکبر بادشاہوں جیسا' گفتگو بظاہر کسر نفسی سے ڈھکی چھپی پر اندر سے انا کی سان پر چڑھی ہوئی' نیند کے ماتے' آرام کے رسیا۔ خلق خدا میں بیٹھنے والے یہ فقیر لوگ دراصل روحانی دنیا کے نیم حکیم ہوتے ہیں۔ جس طرح راشی اور مرتشی ایک دوسرے کے بغیر نہیں چل سکتے اور برابر کے گناہ گار ہوتے ہیں ایسے ہی خواہشات کے پیچھے دیوانے لوگوں کے بغیر ایسے ڈبہ پیروں کا کاروبار نہیں چلتا۔ یہ لوگ بستیوں کی بیچ' خلق میں' ہر دم گھلے ملے رہتے ہیں۔ شاید ان کی خواہش بھی اللہ کے ہاں سچی حضوری سے ہی شروع ہوتی ہو' پر خواہشات سے عاجز آئے ہوئے بندے انہیں استغنا کی سیڑھی چڑھنے نہیں دیتے۔ رفتہ رفتہ ایسے ڈیروں کی شکل' رہن سہن' بالکل کسی متمول شخص جیسا ہو جاتا ہے۔ ڈیرے کے آگے گاڑیاں' کمروں میں ایئر کنڈیشنڈ' بچوں کی تعلیم انگریزی سکولوں کی' شہر کے تونگروں سے میل ملاقات' لباس فیشنی ہونے لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان فقیروں کو اللہ کی تلاش نہیں ہوتی لیکن ان کا حال بالکل ویسا ہوتا ہے کہ بیوہ تو رنڈاپا کاٹتی ہے پر غنڈے کاٹنے نہیں دیتے۔ یہ تو راہ مولا پر چلنے کے خواہشمند ہوتے ہیں پر لوگ انہیں قدم اٹھانے نہیں دیتے۔ یہاں بھی جھگڑا دال چپاتی کا سارا دن چلتا ہے اور خلق پیر کو اپنے ہی رنگ میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے......

کچھ بھگت نظریں نیچی کئے جوتیاں گانٹھتے' چارپائیاں بنتے' باڑھیں کاٹتے' ہائی کورٹ کے سامنے مسلیں لکھتے' چھپے چھپے اپنے اپنے رزق حلال کمانے میں مصروف پر اندر کی سمت نماز درست رکھتے ہیں۔ بنکوں میں' گھروں میں' سائیکلوں پر' کاریں چلاتے ہوئے' کالا کوٹ پہنے' بائیسویں گریڈ کے باوجود پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہر پروفیشن میں آپ کو ایسے اللہ کے پیارے نظر آئیں گے جو دنیا میں ہیں لیکن اس کے طلب گار نہیں ہیں۔ ان کی مسکراہٹ سدا بہار' آواز نیچی' چلت پھرت نامحسوس' کام درست' احکامات کم' ضرورتیں نامعلوم' پسند ناپسند واجبی' گفتگو ضرورت بھر' اور خلق خدا سے رابطہ شفقت کا ہوتا ہے یہ ایسے پیر ہوتے ہیں جن کے پاس کوئی پورٹ فولیو نہیں ہوتا۔ یہ نہ کسی ولایت سے نکلنے نہ کسی میں گھسنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ بس ان کا وجود فطرت کی طرح معصوم ہوتا ہے کہ فطرت

بھی ہر گھڑی کبھی طلوع آفتاب کے ساتھ' کبھی خوشبوؤں کو بکھیر کر کبھی پھلوں کو پیش کر کے' کبھی پھولوں میں بس کر' آبشاروں کی صورت' جھرنوں میں جھلملا کر خدا کے وجود کا اعتراف کرتی رہتی ہے۔ یہ لوگ بھی بڑی معصومیت سے' شور مچائے بغیر صرف اپنے وجود کے حسن سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے رہتے ہیں۔

رجوع کرنے والوں میں سے ایک قسم وہ بھی ہے جن کا اللہ سے "نیوں" لگ جاتا ہے یہ سدا سہاگنیں دن رات اسی کے نام کا دیا جلاتی' اسی کے جس گاتی رہتی ہیں۔ ان کے آنگن اس نام کے انتظار میں سلگتے اور ان کے تن میں اسی کے نام کے کیڑے پڑے رہتے ہیں' یہ مجذوب صفت لوگ کبھی خلق کی طرف راغب نہیں ہوتے کیونکہ لوگ ان کا وقت ضائع کرتے ہیں اور ان کے نزدیک جو دم غفلت میں گزرا وہی رائیگاں رہا۔

اللہ کے فقیروں میں وہ بھی چیدہ چیدہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ اپنے لئے پسند کر لیتا ہے ان کے ماتھے پر لاٹ' ہاتھ کی پوروں میں چکر' آتما میں آنند' شانتی ہوتی ہے یہ بچپن سے درود و سلام بھیجتے ناسمجھی کی عمر سے فضاؤں کی رمزیں سمجھتے ہیں۔ ان کا وجود خوف اور حزن سے پاک ہوتا ہے' یہ دنیا' مصروفیات گرہست کو اپنے ستر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ بیرون میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے ان کے اندر کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اندر ہمیشہ حمد و ثنا جاری رہتی ہے...... ان کا وجود محبت' عجز اور توکل کا مظہر ہوتا ہے۔

علی ہذا القیاس.........

ڈھونڈنے والوں کی بھی ان گنت قسمیں اور پانے والوں کا بھی رنگا رنگ وجود لیکن اشیر خاں ان میں سے کسی وجہ سے بھی شہاب بھائی کے قریب نہ ہوا تھا۔

شہاب بھائی کے وصال سے کچھ دن بعد میں نے خواب دیکھا کہ ایک بہت اونچا پہاڑ ہے جس کی بلندی نیلگوں دھند میں ملی جلی ہے۔ اس چھوٹی سی چوٹی پر ایک ننھا منا پر سکون گھر ہے جیسے سویڈن یا ناروے میں ہوتے ہیں۔ اندر کمروں میں سرخ رنگ کا لمپ شیڈ سرخا سرخ روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ باہر ایک چھتنار ابڑ کا درخت لگا ہے جس کے نیچے ایک سفید بنچ پر شہاب صاحب بیٹھے کچھ پڑھنے میں مشغول ہیں۔ پھر خواب کٹ ٹو کٹ ہو گیا۔ پہاڑ کے نشیب میں یوگی اشفاق ان کے تینوں بیٹے اور میں کھڑے ہیں۔ خاں زور سے آواز دے کر پوچھتے ہیں "قدرت اوپر کیسے آوں؟"

شہاب بھائی ایک لمبی سی رسی نیچے پھینکتے ہیں اس رسی میں دو دو فٹ کے فاصلے پر موٹی موٹی گرہیں پڑی ہیں۔ پلٹتی آواز دے کر شہاب بھائی کہتے ہیں "اشفاق اشیر کو سب سے پیچھے رکھنا تم میں سے اگر کوئی گرے گا تو وہ اسے سنبھال لے گا"۔ ہم پانچوں ہانپتے کانپتے پہاڑی کے اوپر پہنچتے ہیں۔ شہاب

بھائی کے گھر کے ارد گرد لوہے کی نوکیلے کانٹوں والی باڑھ ہے جس پر سے کودنا بے حد مشکل نظر آتا ہے شہاب بھائی ایک قالین نوکیلی باڑ پر پھینکتے ہیں اور کہتے ہیں اثیر خاں کو آگے کرو وہ ایتھلیٹ آدمی ہے تم سب کو پھلانگنے میں مدد دے گا..........."

اثیر خاں ہمارے گھر میں کسی دوسرے شہاب ثاقب کا آدمی ہے.....یوگی اشفاق کے ہاتھ میں جو ترشول ہے وہ ٹیوننگ فورک کی طرح سروں سے پر ہے۔ ترشول کی سب سے تیکھی' جاندار اور سرپھری نوک اثیر خاں ہے۔ وہ سارے گھر میں بگولے کی طرح پھرتا ہے کبھی کھانے کے کمرے میں۔ کبھی لمبے برآمدے میں۔ کبھی چھت پر کبھی لان میں........... اس بچے خوف نویں جماعت میں مائع سے گیس بنے اور خوابوں کی شکل میں اثیر کے ہم رکاب ہو گئے۔ اب اس نے اوپر کوٹھے پر ان خوابوں کی پناہ میں چلنا شروع کر دیا.....وہ کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا...... ہمارے محتاط اندازے یہ تھے کہ کرکٹ کے سہارے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ وہ پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ ہماری رائے میں پہلے ہی پاکستان میں پائلٹ کے پروفیشن میں Saturation آ گئی تھی۔ اس نے ایم بی اے کے لئے آئی ٹونٹی کا فارم منگوایا...... میں نے اپنے خوف اس پر مسلط کر دیئے اور باہر جانے سے روک دیا......... اثیر کے بھائی اپنے اپنے خوف سے رہائی نہ چاہتے تھے۔ ان دونوں نے میری طرح اس اندھے بل ڈاگ کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ لیکن اثیر خاں ہمارے گھر میں سب سے مختلف ہے..... وہ خوف سے رہائی چاہتا ہے اور ایک ہی جست میں کسی ایسے مقام پر پہنچنا چاہتا ہے جہاں دلیری' سچائی اور محنت کسی معجزے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اثیر خاں کے خوف اسے ambavilence کے دروازے پر لے آئے جس کا ایک پٹ نفرت اور دوسرا محبت سے بند ہوتا ہے۔ میرے دونوں بڑے بیٹے خوف کی چادر تان کر سو سکتے ہیں' کھاپی کر سوکھی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ بقول تلقین شاہ۔

پالا لگے رات نوں.......... مینوں وکھاں دا کمبل دے
میں اوکھا دن گزاریا.......... مینوں سوکھا ہوون دے

لیکن اثیر خاں مختلف ہے جیسے وہ اس عہد میں رہ رہا ہو جب ابھی اسلام کا پیغام نہ پھیلا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ایک بڑے پیام کی سرگوشی کسی سے کرنا چاہتا ہو لیکن خوف نے اس کے لب سی رکھے ہوں۔ وہ گھر سے گھر تک..... ایک شخص سے دوسرے تک..... گلیوں میں' بازاروں میں..... گھومتا ہو...... لوگ اسے کھجور کھلا کر پانی پلانا چاہیں.......... وہ بھی پینا چاہے لیکن پی نہ سکے..... اندر کے کرب پر منہ بند خوف کا ڈھکنا کھولنا چاہے لیکن صرف پھرتا رہے۔

یہ صبر کی کیفیت اس میں بہت بچپن میں پیدا ہو گئی تھی۔

ابھی وہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا جب اچانک اسے تیز بخار آنے لگے۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔

بہت علاج کئے بخار دب جاتا۔ کچھ دن ختم رہتا' پھر سر نکال لیتا۔ اس بخار کی عجیب کیفیت تھی چڑھتے ہی کبھی ۱۰۴ ڈگری ہو جاتا کبھی ۱۰۵ ڈگری سے بھی تجاوز کرنے لگتا لیکن اثیر خاں بخار میں بھی میری تسلی کا باعث رہتا وہ اپنی معصوم زبان میں کہتا......

"امی ٹھیک ہو جائے گا۔ اتر جائے گا بخار......"

بخار اتنے سال آتا رہا کہ اس کے دانتوں کا رنگ پلی اینٹ جیسا ہو گیا۔ آنکھیں زرد اور چہرہ باسی رہنے لگا پھر ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اسے Liver abcess ہے......جونہی آپریشن ہو گا بخار کی کیفیت جاتی رہے گی جس وقت اسے آپریشن تھیٹر سے باہر لائے اسی شام اسے دوبارہ بخار آنے لگا۔

پھر ایک معجزہ ہوا......

صبح کے وقت ڈاکٹر احمد خاں نے داستان سرائے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ بولے...... "کیا گھر پر کوئی بیمار ہے؟ رات میں نے خواب دیکھا جیسے تمہارے گھر میں خیریت نہیں"۔

ڈاکٹر احمد خاں ملتان میں ڈائریکٹر ایگریکلچر ہوا کرتے تھے اور شغل کے طور پر ہومیو پیتھی کا علاج کرتے تھے۔ میں نے اپنے بیٹے کا حال سنایا۔ انہوں نے مجھے کہا......

"چونکہ خواب میں بشارت ہوئی ہے اس لئے میرے علاج سے انشاء اللہ بچہ ٹھیک ہو جائے گا تم باقاعدگی سے علاج کرنا......"

میں باقاعدگی سے علاج کرنے لگی لیکن مجھے ہومیو پیتھی پر اعتماد نہیں تھا۔

میرا خیال تھا جو اتنے جتن سے ٹھیک نہیں ہوا اس کی زندگی کا کیا بھروسہ۔ اس لئے نہ میں اسے کبھی پڑھنے دیتی نہ کسی چیز سے منع کرتی۔ اثیر گڈیاں اڑاتا' بندوق لے کر چھپکلیاں مارتا' کرکٹ کھیلتا...... اسے وقت ضائع کرنے پر کسی نے کبھی نہ ٹوکا...... بیماری کے یہ سات سال ہر وقت خزاں کا موسم رہا...... آہستہ آہستہ ڈاکٹر احمد خاں کے علاج سے اثیر رو بہ صحت ہونے لگا...لیکن اس سارے وقت کا اس کے دل پر ایک عجیب سا اثر رہا۔ اس نے اپنی ڈائری میں سب کی نظروں سے چھپا کر ایک مرتبہ لکھا............

"انسان کی سوچ ایک عجیب چیز ہے۔ ایک خیال کی کمی بیشی سے انسان خودکشی سے اتر جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ آٹھ سالوں میں میرے ساتھ ہوا وہ آپ کے ساتھ بھی ہو رہا ہو...... سوچ...... سوچ اور پھر سوچ۔ بچپن میں کسی وجہ سے نہ تو آپ سے کوئی امید رکھی جاتی ہو اور نہ ہی آپ میں کوئی توفیق رکھی جائے کہ آپ نے کیا کرنا ہے؟ ماں باپ اور دوسروں کی محفل میں خوشی اور راحت تو بہت محسوس ہوتی ہے لیکن جب وقت گزر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوچ اب عادت بن گئی ہے۔ ایسی سوچ جس کو آپ کا ضمیر پسند نہیں کرتا جو آپ کو عمل

سے دور لے جاتی ہے۔ ایسے میں دعا کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں جو آپ کو اس سوچ کی مصیبت سے بچائے سب کچھ روٹین میں بدل دے اس طرح خیال کا پنڈولم کبھی اس میدان میں کبھی اس میدان میں رہتا ہے حالانکہ میدان تو صرف ایک ہے............

معجزے کا میدان...... اور صاحب معجزہ کی دعا............ اسی دعا کے سہارے انسان دوبارہ کشتی پر سوار ہو سکتا ہے..........."

اثیر خاں ایک معجزے کا منتظر تھا بالکل ویسا معجزہ جیسا اس کی صحت کے ضمن میں ہوا تھا۔

اسے ان ہونیوں کی آس تھی۔ وہ اپنی ذہانت اور جذبے دونوں سے خوفزدہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کہیں اندر ہی اندر ان دونوں میں بغیر دنگا فساد ہوئے سمجھوتہ ہو جائے...... وہ شہاب بھائی سے فقط اس معجزے کی آس رکھتا تھا کہ وہ اسے ہر خوف سے نجات دلا دیں۔ سوچوں سے آزاد کریں۔ اور عام سی کشتی پر معمولی سے مسافر کی طرح چڑھا دیں۔

اس معجزے کے انتظار میں اس نے کئی برس کتنے ہی میل اپنے پیروں پر پیدل گزارے تھے اور منہ بند رکھا تھا۔ آنکھوں کو چھلا چھل چلنے سے روکا تھا۔ وہ معجزے کا انتظار کرتا تھا۔ جیسے اسلحہ ختم ہو جانے پر بہادر جرنیل کمک کا انتظار کرتا ہے۔ اس نے اپنی بندوق کسی کو مستعار دے دی تھی۔ سائیکل گیراج میں لاک پڑا رہتا تھا۔ کرکٹ وہ کھیلتا آنکھیں بال پر لیکن کان کسی اور آواز پر لگے رہتے۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ آواز کہاں سے آئے گی؟

اسی لئے شہاب بھائی نے آواز دیئے بغیر اسے اپنے قریب کر لیا۔ دیر تک ارض و سماء منتظر رہیں تو ٹھنڈی ہوا ایک دن ضرور چلتی ہے انگور کے خوشے آپی آپ میٹھے رس سے جھلجھلاتے ہیں۔ اثیر معجزے کا آدمی ہے اور معجزہ ہو گیا...... اثیر خاں محنت کو ماننے لگا۔ روٹین پر ایمان لانے لگا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ معجزے کی اصلی روح یہی ہے کہ انسان کسی معجزے کا انتظار نہ کرے۔

جب بھی شہاب بھائی آتے اثیر کی حالت کچھ اور ہوتی۔ وہ شہاب بھائی کے تعاقب میں رہتا۔ جیسے کوئی نوجوان کنوئیں پر آنے والی لڑکی کا انتظار کئی درختوں کے پیچھے باری باری چھپ کر کرتا ہے۔ وہ شہاب بھائی کے قیام کے دوران گھر سے باہر شاذ ہی جاتا۔ اس کے کان ان کی آواز پر لگے رہتے...... سب کی نظریں بچا کر وہ شہاب بھائی کے کمرے میں جایا کرتا اور ان کے پاس بیٹھتا...... شہاب بھائی اسے سمجھاتے...... "عام آدمی اور خاص آدمی کے سفر میں فرق نہیں ہوتا۔ دونوں جب بچہ ہوتے ہیں تو ہنستے کھیلتے ہیں۔ جوان ہونے پر عشق کرتے ہیں۔ محنت سے گھر کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام آدمی کو معلوم نہیں ہوتا کہ ایک رستہ کس وقت بند گلی میں ختم ہوتا ہے وہ اگر عشق کرتا ہے تو

ساری عمر، ادھیڑ ہو کر کبھی کبھی بڑھاپے میں بھی اسیر زلف ہی رہتا ہے وہ اگر کھانے پینے کا، بنسری بجانے کا، خوش لباسی کا، خطوط نویسی کا...... غرضیکہ کوئی بھی شوق پالتا ہے تو آخری وقت تک ان ہی مشغلوں کے سہارے جیتا چلا جاتا ہے۔ اس میں نہ بڑھاپے کی Acceptance پیدا ہوتی ہے نہ ہی ارتقاء کا حوصلہ...... میں ایک زمانے میں دلربا بجاتا تھا، لیکن پھر اس شوق کی منتہا پر پہنچ کر مجھے لگا کہ میری روح کی پہنائی کے لئے یہ کم ہے...... رفتہ رفتہ...... آہستہ آہستہ شوق...... کبھی پورے ہو کر، کبھی ادھورے رہ کر، کبھی Consume ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو آدمی اللہ کے راستے کا شوق پال لیتا ہے وہ ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے وہ اس شوق میں کچھ نہیں پا سکتا اس لئے چلتا رہتا ہے کسی معجزے کرامت کی راہ نہیں دیکھتا۔ اور حسن خاتمہ پر منتج ہو جاتا ہے...... جو آدمی بڑھاپے میں اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے، بنی پکڑتا ہے، جوگنگ کرتا ہے اور اپنے آپ کو جوان ثابت کرنے کے لئے بال رنگتا ہے، صحت مندی کے ذریعے اپنی فلاح چاہتا ہے...... جو بیماری، سفید بال، کمزور ٹانگوں، بے مصرف زندگی کی افادیت کو نہیں سمجھتا وہ حسن خاتمہ کا طالب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس تک پہنچ سکتا ہے...... جوانی لوٹ آنے کا معجزہ ہو نہیں سکتا اور بڈھا ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اس لئے صرف Pedestrian رہو...... خود بخود خوف کے نرغے سے نکل جاؤ گے...... چلتے رہنا بذات خود ایک معجزے سے کم نہیں......

اثیر خاں کی کوشش ہوتی جہاں بھی شہاب بھائی جائیں وہی ان کا ڈرائیور ہو۔ وہ دھیان رکھتا کہ سونے سے پہلے تھرموس میں پانی ڈال کر ان کی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا جائے۔ شہاب بھائی پانی مانگتے تو وہ برف کوٹ کر ایسا ٹھنڈا پانی لاتا کہ وہ خوش ہو جاتے۔

"آج اشفاق علی خاں کے گھر چلیں گے؟"

"جی اچھا......"

وہ وقت سے پہلے تیار ہو کر ان کے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

"آج مسعود کے گھر جانا ہے...... مسعود کھدر پوش......"

"جی اچھا......"

اس نے ہم سے کبھی دل کی بات نہ کی لیکن جب بھی وہ ان لمبی ڈرائیوز پر جاتے اپنے خوف اور ان سے جنم لینے والے خوابوں کا ذکر شہاب بھائی سے ضرور کرتا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ شہاب بھائی سب کچھ سننے کے بعد کہتے ہوں گے...... "

Let it pass

کیونکہ شہاب بھائی نہ تو کسی کے حالات میں دلچسپی رکھتے تھے...... نہ مسائل کا سلجھاؤ کرنا چاہتے تھے......

بس وہ ہماری الجھنوں کا بوجھ کسی مافوق الفطرت طریقے سے اٹھا لیتے تھے...... مسئلہ رہتا تھا...... لیکن تکلیف باقی نہیں رہتی تھی...... حل نہیں ملتا تھا لیکن یوں لگنے لگتا کہ اب مسئلے کے حل کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اثیر خاں کی وجہ سے شہاب بھائی کے کچھ اور پرت کھلنے لگے۔ اب وہ کھانے کے بعد سونے سے پہلے ہمارے کمرے میں آ جاتے، صوفے پر بیٹھتے اور اپنی اس ٹانگ کو آگے پھیلا کر بیٹھ جاتے جس میں حسیات ختم ہو چکی تھیں۔ اس ٹانگ کے نیچے اثیر خاں گدی رکھ دیتا۔ ان محفلوں میں عموماً کوئی بڑا موجود نہ ہوتا۔

انیق خاں اور غزل، انیس خاں اور ثوبیہ، اثیر خاں اور میں ان کی پھیلی ٹانگ کے ارد گرد انگریزی کے "یو" کی شکل میں بیٹھ جاتے۔ فضا میں اشتیاق، حسرت، تحیر پھیل جاتا۔ بظاہر یوں لگتا جیسے اثیر خاں غیر متوجہ ہے۔ وہ گروہ سے الگ تھلگ بیٹھتا۔ نہ سنتا نہ سوال کرتا...... بس شہاب بھائی کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز جب ثوبیہ چائے انڈیل رہی تھی اور غزل سب میں مٹھائی بانٹنے میں مشغول تھی انیس نے سوال کیا...... "شہاب چچا غصے کو دور کرنے کی کوئی ترکیب بتائیں......؟ چھپا ہوا غصہ، اعلانیہ آنے والا...... نہ ٹلنے والا غصہ"

شہاب بھائی مسکرائے پھر چائے کی پیالی وصول کی اور بڑی دردمند آواز میں بولے...... "غصہ دراصل آنا ہی نہیں چاہئے۔ اگر آپ واقعات، حالات، چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے میں سے گزر جانے دیں جیسے پانی چھلنی میں سے گزرتا ہے تو بہت جلد ایسی عادت بن جائے گی کہ غصہ کم آنے لگے گا......"

اثیر خاں نے بغیر سنے یہ چھلنی قبول کی۔

"لیکن شہاب چچا ہمارے اندر تو جب کسی بات پر غصہ چڑھ جائے تو کسی طرح گزرتا ہی نہیں"۔ غزل بولی۔

"مثال کے طور پر کسی نے آپ کو کچھ کہا تو اب اس بات پر ری ایکشن فورم نہیں کرنا۔ بس بات آئے اور گزر جائے۔ مشکل ساری یہی ہے کہ آپ رد عمل کے طور پر یا تو کچھ کرنا چاہیں گے یا جواب دینا چاہیں گے۔ ان دونوں چیزوں سے پرہیز کرنا ہے۔ بات آئے بری لگے لیکن Let it pass

"بڑا مشکل ہے...... شہاب چچا" انیق خاں بولے

"ہاں مشکل ہے لیکن زیادہ نہیں تھوڑی سی پریکٹس سے غصے پر قابو پایا جا سکتا ہے شروع میں آپ صرف برے عمل سے بچیں...... مثلاً غصے میں پلیٹ نہ توڑیں...... کسی کو فون نہ کریں...... تھپڑ نہ ماریں ہاتھ نہ چلائیں"

ثوبیہ نے اپنی شہد رنگی آنکھیں حیرت سے کھول کر پوچھا "پر وہ کیسے شہاب چچا...... ناممکن

ناممکن...... "

"پہلے پہل صرف ہاتھوں کو قابو میں کریں...... رفتہ رفتہ زبان کو کنٹرول کریں...... اس کے بعد اندر کے خیالات کی باری آئے گی...... اندر سوچ بھی غصے والی نہ رکھیں...... جب آپ واقعات 'گفتگو' حادثات کو پاس کرنے کی اجازت دیں گے تو زیادہ دیر نہیں گزرے گی اور آپ کی اتنی پریکٹس ہو جائے گی کہ اول تو عام باتوں پر غصہ نہیں آئے گا...... پھر آہستہ ...... آہستہ آہستہ خاص باتوں پر بھی انا مجروح نہیں ہوگی...... اس سے آگے ایک وقت ایسا آئے گا جب غصہ انا کی وجہ سے آئے گا ہی نہیں......

"اور جب تک اتنی پریکٹس نہ ہو اور غصہ آجائے تب...... تب کیا کریں شہاب چچا ......" انیس خاں بولے۔

شہاب بھائی نے اثیر خاں کی جانب ذرا سا دیکھا اور بولے...... "اگر کبھی زبان اور ہاتھ چل جائیں تو پھر آسان طریقہ ہے...... دل سے پشیمان ہوں اور دو رکعت نفل نماز کفارہ ادا کریں۔ نفس پر یہ سزا بہت گراں گزرتی ہے...... جب دن میں کئی بار غصے کے عمل سے نالاں ہو کر نفل پڑھنے پڑے تو بہت جلد غصہ کم آنے لگے گا...... "

"پھر میں تو سارا دن جائے نماز پر ہی رہوں گی......" ثویلہ نے کہا۔

"میں بھی......" غزل بولی۔

"اور میں بھی..........." انیق خاں نے کہا۔

"اور میں تو پہلے..." انیس بولا۔

سب ہنسنے لگے...... لیکن اثیر خاں چپ رہے۔ وہ بغیر سنے آنک رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہو گا؟ عجلت' لاپرواہی' غصے کی طنابیں کیسے کھینچی ہوں گی اور شہاب بھائی کی بات کو زندگی میں کیسے سمونا ہو گا......

پھر ایک روز یوں ہوا

شہاب بھائی ہمارے کمرے سے جانے والے تھے۔ غزل نے ذرا سا دروازہ کھول کر پوچھا......

"شہاب چچا آپ دودھ پئیں گے؟...... "

شہاب بھائی کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

"اشفاق شہد ہے تیرے پاس......" شہاب بھائی نے پوچھا

خان صاحب پلنگ پر اپنی مخصوص نشست میں ایک بازو سر تلے' ایک زانو کھڑی ٹانگ پر' دوسری ٹانگ دھرے پاؤں کے تلوے پر ہاتھ جمائے ہوئے تھے۔

"ہاں یار ہے تو سہی پر وہ چھوٹی مکھی کا شہد ہے اور آنکھ میں ڈالنے کے لئے چیچا وطنی سے منگوایا ہے"۔

اثیر اٹھ کھڑا ہوا اور شہد کی بوتل تلاش کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلا گیا۔

"غزل ایک چمچ بادام روغن اور ایک چمچ شہد کی ملا کر لانا......"۔

غزل اتنی خوشی سے گئی جیسے غزال صحرا میں چوکڑیاں بھرتا جاتا ہے......

اب خان اور شہاب بھائی میں شہد پر گفتگو ہونے لگی۔

"یار بڑا مہنگا شہد ہے اور صرف آنکھوں میں ڈالنا چاہئے...... "

دونوں دوست اب خوش دلی سے کتنی ہی دیر شہد' اس کی وصولی' استعمال' دریافت' افادیت پر باتیں کرتے رہے۔ ہمیں پتہ نہ چلا کہ کس وقت غزل دودھ میں شہد' اور بادام روغن ملا کر لے آئی۔ جس وقت وہ دودھ پی رہے تھے دروازے پر دستک ہوئی۔ انیس کے دوستوں کی ایک کھیپ اندر آئی اور شہاب بھائی کے ارد گرد گھیرے میں بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں شہاب بھائی میں وہ کیا کرشمہ' حسن' کھنچاؤ تھا کہ نوجوان ان کے پاس بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ عام طور پر یہ نوجوان "سلام انکل سلام آنٹی" کہہ کر پلا چھڑایا کرتے ہیں لیکن شہاب بھائی کو دیکھ کر آزاد پرندے بسرام کرنے لگتے۔ کوئی کرسی پر آگے ہو کر کوئی کھڑے زانو کے گرد بازو لپیٹ کر کوئی سر جھکائے چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بیٹھ جاتا' سب نوجوان ان کے حکم' ارشاد' گفتگو' کی راہ دیکھتے اور لطف کی بات یہ کہ ان سب کو بھی علم نہ ہوتا کہ وہ کسی ندی کے بہنے' پھول کے کھلنے' ہوا کے چلنے کے منتظر ہیں۔

اس روز ارشاد ہوا......

"ہاں تو قاسم تم پوچھتے ہو کہ اگر میں اس ملک کا بادشاہ بن جاؤں تو کیا کروں؟...... "

"جی چچا......" قاسم نے عینکوں کے پیچھے سے حیران آنکھوں سے پوچھا۔

شہاب بھائی سے سیاست پر بہت کم باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی اخبار کی سرخیاں پڑھ کر مسکرایا کرتے اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں ان سرخیوں کے بے معنی پن پر تبصرہ کرتے رہتے لیکن سیاست پر نہ کبھی انہوں نے دھواں دھار تقریر کی نہ لمبے چوڑے مباحثوں میں شمولیت کی۔

"پھر چچا جو آپ پاکستان کا بادشاہ بن جائیں تو کیا کریں...... "

اثیر خاں نے خفگی سے قاسم ادریس کی طرف دیکھا۔

"میں کیا کروں......؟ کچھ بھی نہیں......" شہاب بھائی مسکرا کر بولے۔

"کوئی رفارمز تو ہوں گی...... زرعی یا اصلاحی......" شاہد افضل بولا۔

"نہیں چچا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بس میں آرام سے پادشاہت کروں...... زیادہ سے زیادہ رشوت کو Legalize کر دوں۔ کچھ لوگوں کا کام اگر حکومت کے کارندے جلدی کر دیں تو کچھ حق خدمت لیگل ہو...... دسویں تک امتحان

موقوف...... صرف حاضری سو فی صد ہو...... بعد میں دسویں کی ڈگری مل جائے"۔
شاہد افضل جوشیلا نوجوان ہے۔ وہ چہک کر بولا...... "لیکن چچا یہ کیسے پتہ چلے گا کہ دسویں کا کورس اسے آ گیا ہے......"
شہاب بھائی بڑی خوش دلی سے بولے...... "جو دس سال سکول آتا رہے گا تو کچھ نہ کچھ تو سیکھ ہی جائے گا ویسے بھی آخر دسویں پاس کو آتا ہی کیا ہے......"
سارے دسویں پاس لڑکے لڑکیاں ایسے خوش ہو گئے جیسے انہوں نے فری دسویں پاس کر لی ہو......
"شہاب چچا پر پلیز بتائیں کیا آپ کوئی تبدیلی نہیں لائیں گے...... کوئی بھی؟......"
قاسم کچھ کر گزرنے والا نوجوان تھا اس کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کچھ ریڈیکل ہو اور وہ اس بنیادی تبدیلی میں اہم حصہ لے۔
"ہر سوسائٹی' ہر معاشرہ' ہر وقت تبدیل ہو رہا ہے۔ کچھ تبدیلیاں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ تہہ در تہہ ہو رہی ہیں۔ آمد و رفت کے وسائل سے' میڈیا کے وسیلے سے دنیا سکڑ رہی ہے اب جو کچھ مشرق بعید میں ہوتا ہے دور دور تک مغرب میں اثر رکھتا ہے...... مختلف نسلوں اور رنگوں کے لوگ عجیب نہیں لگتے۔ کلچروں کا بعد کم ہو رہا ہے تبدیلی ظاہری اور باطنی ہوتی رہتی ہے لیکن ایک بہت باریک سی تبدیلی ہے جو اللہ کی مشیت سے آتی رہتی ہے۔ جو شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے جو کچھ ہو گا اسی کے حکم سے ہو رہا ہے' وہ ان فروعی تبدیلیوں سے پریشان نہیں ہو گا...... جیسے کسی معزز شہری کی آمد سے پہلے پنڈال میں کرسیاں لگتی ہیں۔ شامیانے کی طنابیں کسی جاتی ہیں۔ ڈائس بنتا ہے...... ایک خالی خولی میدان میں جب بہت ساری تبدیلیاں خاطر خواہ طور پر آ جاتی ہیں تو پھر صاحب صدر کی سواری آتی ہے......"
"یعنی کچھ نہیں بدلنا؟...... بس ایسے ہی رہنے دیں سب کچھ؟......"
شہاب بھائی دودھ پیتے رہے پھر بڑی دیر بعد بولے...... "اس باریک تبدیلی کو پہچاننے کی کوشش کرنی ہے' اس کا دھاگہ پکڑنا ہے' پھر اندر باہر جو بدلتا ہے بدل جائے پر دھاگے کو نہیں چھوڑنا...... آپ سب جانتے ہیں۔ جو تبدیلی ہم خود لاتے ہیں اس میں کچھ اچھا ہوتا ہے کچھ برا...... لیکن جو تبدیلی اللہ لاتا ہے وہ ساری کی ساری اچھی ہوتی اس میں اچھا برا ملا جلا نہیں ہوتا......"
سارے لڑکے لڑکیاں خوش خوش اٹھ گئے۔
کچھ نے یہ جانا کہ سائیڈ برنز پر شہاب چچا ناراض نہیں کیونکہ یہ تبدیلی فروعی ہے ایک دو نے یہ سمجھا کہ میڈیا اور ٹرانسپورٹ دراصل فاصلوں کو کم کرنے کی انسٹی ٹیوشن ہیں۔ چند نے سوچا کہ شہاب بھائی تو بڑے پروگریسو ہیں۔ رشوت کو بھی لیگا لائیز کر رہے ہیں۔
ایک لڑکی نے سر سے دوپٹہ اتار دیا اور سمجھ گئی کہ جو شخص امتحان ہی نہیں چاہتا اس سے کیا ڈرنا۔ جو

انگشتانہ بھر سکا وہ انگلی کے پوٹے بھر ساتھ لے گیا۔ جو دیگ ساتھ لایا تھا وہ بے شمار سمیٹ لے گیا۔
ان ہی سب میں کہیں اشیر خاں بھی تھا جو بے قراری کے عالم میں کبھی آتا کبھی جاتا...... نہ وہ سنتا تھا نہ سمجھتا تھا پر کہیں سے شہاب بھائی کے وجود سے اسے کرنٹ مل رہی تھی اور وہ چوزے کی طرح اس محبت بھرے سینک کو محسوس کر رہا تھا۔
گرمیاں تھیں۔
موسم اپنی شدت سے جامن اور آم پکانے میں مصروف تھا۔ صبح صبح اعجاز بٹالوی مکھن سے بھرا کٹورا دے گئے' دن چڑھے پر جمیلہ ہاشمی نے آموں کی پیٹی بھیج دی' دوپہر کے کھانے پر شمیم فاطمہ نے تھیلا بھر جامن بھجوائے۔ شام کو دھرم پورے کے ڈیرے پاک سے کھانا آ گیا۔ اقبال بھائی آئے تو ان کی کار میں سیٹ بھر ٹیوب روز کے گلدستے تھے...... غفار اپنی لیتھ مشین پر سٹین لیس سٹیل کی گراریاں بنا لایا...... عکسی مفتی چند گھنٹے ٹھہرا اور خان کے لئے سوسی کے جوڑے دے گیا...... بھائی ابوالحسن اور سعیدہ جی خوبصورت اجرک اور چادریں چھوڑ گئے۔ پروین عاطف خوشبو کی بوتلیں دھر کر غائب ہو گئی...... عشرت نے ملتان سے انور راٹول کی پیٹیاں بھیج دیں۔ ڈاکٹر مسعود اختر داتا دربار کے ہار لے کر حاضر ہو گئے۔
یہ ہمیشہ ہوتا تھا۔ ادھر شہاب بھائی کاسنی کمرے میں ٹھہرتے ادھر نعمتیں گھر کا طواف کرنے لگتیں۔ جس طرح برسات کی شاموں میں پتنگے روشنی پر گرتے ہیں۔ ایسے ہی ان جانے لوگ 'لفافے' طشت' شاپر' ٹوکریاں' چھابے لے کر آتے رہتے۔ وہ سب بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ خوشی کیوں ہے؟ اور ہم جو ہاتھ بڑھا بڑھا کر "فتوحات" قبول کرتے' ہمیں بھی علم نہ تھا کہ کاسنی کمرے والے کی برکت سے یہ ہار پان' پھول اور پھل فضا کو مہکانے کے لئے آتے ہیں۔
اس شام ہم شہاب بھائی کی فتوحات کے آم کھا رہے تھے لیکن فضا بوجھل تھی خان صاحب آم کاٹ کر دے رہے تھے وہ آم کے دونوں جانب کے قتلے کاٹ کر شہاب بھائی کو دیتے اور خود گٹھلی کھانے لگتے۔ کچھ دیر بعد شہاب بھائی بولے...... "یار اشفاق یہ تو ہمیشہ کیوں غریبو سا گٹھلی کھانے لگتا ہے' آج قتلے تو کھائے گا اور گٹھلی مجھے دے گا"۔
شہاب بھائی غریبو سی گٹھلی کھاتے رہے اور چھوٹی چھوٹی مزے دار باتوں سے فضا کو اجالتے رہے لیکن اس روز فضا میں نمی پچانوے فی صد تھی ان کی باتوں سے بھی چہروں پر خوشی نہ آئی۔ دراصل ہم تینوں صدیقہ جاوید سے مل کر آ رہے تھے چودھری برکت علی کی بیٹی 'ادب لطیف کی ایڈیٹر صدیقہ بیگم کے شوہر اور خان صاحب کے بھانجے جاوید طارق نے دوسری شادی کر لی تھی اور صدیقہ سے ملنے کے بعد ہم تینوں کے دلوں پر عجیب قسم کا بوجھ تھا۔ فضا میں صدیقہ کے آنسوؤں کی سیلن تھی بڑی دیر کے بعد ارشاد ہوا......
"اشفاق...... ہم لوگ غم اور Bitterness میں فرق نہیں کرتے۔ غم بڑی مفید چیز ہے یہ اللہ کی

رضا کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے۔ اپنی شخصیت اور عاقبت سنوارنے کے لئے اہم ہے۔ غم نہ ہو تو زندگی آدھی رہ جائے لیکن غم میں bitter ہو جانا، اپنے آپ سے بھی ناانصافی ہے اور اللہ پر توکل کے بھی منافی ہے۔ صدیقہ کو چاہئے کہ وہ غم کرے، آنسو بہائے، اس سے اللہ کی رحمت جاگتی ہے تلافی کے امکانات بڑھتے ہیں لوگوں کی ہمدردی، محبت حاصل ہوتی ہے۔ غم میں نئے ساتھی ملتے ہیں۔ زخم پر پھاہے رکھنے والوں کا ساتھ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب آدمی تلخ ہو جائے تو وہ جھگڑے میں پڑ جاتا ہے اپنا استحقاق سمجھ کر منوانے کی ضد کرتا ہے۔ حاصل حصول تو وہی ہوتا ہے، جو اللہ کو منظور ہوتا ہے اس احتجاج میں شخصیت تباہ ہوتی ہے اللہ پر ایمان کمزور ہوتا ہے اور دنیاوی طور پر بھی کئی ایسے نقصان ہو جاتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں رہتی اگر تمہارا صدیقہ پر کچھ اختیار ہے تو تم اسے یہی سمجھاؤ...... غم کرے...... آنسو بہائے لیکن جھگڑا نہ کرے...... تلخ نہ ہو، تندی میں نہ آئے، راضی برضا رہے"۔

ہمارا صدیقہ پر کوئی اختیار نہ تھا...... اس کے آنسو اتنے بے ساختہ اور چہرہ یوں مظلوم تھا کہ اس کے سامنے ہم دونوں کی زبان بند ہو جاتی۔ فروعی باتیں ہوتی رہتیں۔ شہاب بھائی کی بات کا اعادہ ممکن نہ ہوتا۔

فیض ڈے والی رات کا ذکر ہے۔

اس روز الحمراء کے ہال نمبر ایک میں لوگ بڑے دھوم دھام سے فیض صاحب کی یاد کو نذرانے دینے کے لئے آئے تھے۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ شہاب بھائی صدارت کر رہے تھے۔ تصویریں کھنچ رہی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا جیسے شہاب بھائی موجود نہیں ہیں۔ جب فنکشن کے بعد ہم گھر آ رہے تھے تو کار میں میں نے پوچھا...... "شہاب بھائی کبھی کبھی آپ غائب ہو جاتے تھے...... وہ کیوں؟"

شہاب بھائی مسکرائے اور بولے...... "مجھے جب وقت ملتا ہے میں اندر کی ٹکٹکی چلا لیتا ہوں......"

"اندر کی ٹکٹکی؟......" خاں صاحب نے پوچھا۔

"یار ایئر پورٹ ہو...... پلیٹ فارم ہو...... کوئی ایسی جگہ ہو جہاں لمبا چوڑا انتظار ہو تو میں اندر ذکر شروع کر دیتا ہوں...... پھر نہ وقت کا پتہ چلتا ہے نہ میں کبھی بور ہوتا ہوں......"

"قدرت یہ تو کیسے کرتا ہے دنیا کا ہر کام بھی کر لیتا ہے اور اندر کی کمپس بھی درست رکھتا ہے...... کیسے؟ کیسے کیسے؟؟"

خاں نے کار کی وہیل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا

"اگر تم کسی سے میری ٹکٹکی کا ذکر نہ کرو تو میں تمہیں دنیا کو دین بنانے کا نسخہ دے سکتا ہوں......"

ہم دونوں خوشی سے اچھلے اور وعدہ کر لیا......

"زیادہ Involve ہوئے بغیر دنیا کے کام کرو...... سارے کام...... لوگوں سے زیادہ گھال میل کے بغیر ان سے ملتے رہو...... ان کی غمی خوشی میں شامل رہو۔"

"تیرا خیال ہے قدرت یہ آسان کام ہے......؟"

"آسان تو نہیں لیکن کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ جب کچھ حاصل کرنا چاہو گے تو قدرتی طور پر مبتلا بھی زیادہ ہو گے...... یہ جو تو اتنا کثیر المقاصد ہے اشفاق، یہ رنگا رنگی کم ہو جائے گی...... جب دنیا میں رچ بس کر اس کی گہما گہمی میں کھو کر زندگی بسر نہ کرو تو آہستہ آہستہ اندر گرما گرمی پیدا ہونے لگتی ہے...... بس یہ ہی نسخہ ہے دنیا کو دین بنانے کا...... سب کام کرو...... سب میں ملے جلے رہو پر اندر کی ٹکٹکی جاری رہے...... اندر کے سفر میں پیدل چلنا کم نہ ہو دھیان ادھر ہی رہے"۔ گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ شہاب بھائی خاموش ہو گئے غالباً انہوں نے اپنی ٹکٹکی جاری کر لی تھی ہم دونوں چپ ہو گئے لیکن میرے اندر کا شور بڑھ گیا جب تک میں کسی سے بولتی نہ رہوں یا وہ مجھ سے باتیں نہ کرتا رہے مجھے لگتا ہے کہ یا وہ ناراض ہے یا جلد ہی میری زود رنجی اسے ناراض کر دے گی۔ خاموش ہوتے ہی تنہائی کا بگھیرا دبے پاؤں میری طرف بڑھنے لگتا ہے۔ میں ماحول، لوگوں کے چہرے موسم کا منہ تکنے لگتی ہوں۔ اس رات بھی میں نے شہاب بھائی کا چہرہ چاندرات میں دیکھا وہ چپ تھے لیکن اداس نہیں تھے انہیں یہ خوف بھی نہیں تھا کہ انہیں چپ پا کر ہم ناراض ہو جائیں گے...... انہیں ہم سے کچھ حاصل نہیں کرنا تھا۔ وہ ہم سے کچھ چاہتے نہیں تھے۔ نہ ہماری رائے، نہ ہماری خوشنودی، نہ ہماری دوستی نہ ہماری دشمنی، بس ایسے آزاد شخص کے لئے ہر ماحول میں خوش رہنا اور کبھی بور نہ ہونا کتنا آسان تھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو اثیر خاں گیٹ پر کھڑا تھا۔ کار اندر چلی گئی تو وہ بھی چپ چاپ اندر جانے لگا۔ شہاب بھائی نے آہستہ سے پوچھا...... "کیوں بھئی سوئے نہیں......

"بس جی ایسے ہی...... وی سی آر دیکھ رہا تھا......"

اثیر کا سی دروازے کے آگے رکا اور لاتعلقی سے بولا...... "شہاب چچا پانی پئیں گے؟"

"ہاں بھئی اگر ٹھنڈا ہو تو کیا کہنے......"

اثیر خاں نے یخ پانی تھرموس میں ڈالا اور ایسی بے پرواہی سے تھرموس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی گویا ساری شام اس نے کسی کا انتظار ہی نہ کیا تھا۔

ویسے انتظار تو جمعدارنی سرداراں بھی شہاب بھائی کا بہت کیا کرتی تھی۔

دھان پان اجلی اجلی نازک چہرے اور بدن والی سرداراں ٹاکی پھیرتے کہتی......

"اب تو بہت دن گزر گئے ہمارا بابا نہیں آیا......"

سرداراں کی آواز دھیمی، لباس صاف اور چہرہ کھتری عورتوں کی طرح ملائم ہے وہ بھی غالباً

جھاڑو پھیرتی، ٹاکی مارتی اپنے بیٹے اللہ وسایا کی ٹکٹکی چلائے رکھتی ہے۔ عورت اور بھگت کا ہمیشہ سے ایک ساحال ہے۔ غالباً اسی لئے برصغیر کے صوفی حضرات نے عورت ہی کی زبان میں اللہ کو یاد کیا ہے۔

عورت بچے کا جاپ نہیں چھوڑتی اور اللہ کا پیارا ادھر کی رسی نہیں چھوڑتا...... اسی لئے جب کبھی کوئی عورت کسی اللہ کے پیارے کو دیکھ لیتی ہے اس کے سر پر آپی آپ دوپٹہ آجاتا ہے وہ مؤدب ہو جاتی ہے ہاتھ جوڑ کر بات کرتی ہے۔ غیر شعوری طور پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی کو میرے وجود کی پروا نہیں...... یہ خواہشوں کے تمام دریچے بند کر چکا ہے۔ عورت ایسے اچھنبے کے سامنے کبھی گستاخ نہیں ہوتی۔ اپنی نہیں منواتی۔ نظر نیچی رکھتی ہے......

سرداراں بھی نظر نیچی کر کے ٹاکی مارتے شہاب بھائی سے باتیں کرتی جاتی۔

"باباجی میرا اللہ وسایا بڑا کمزور ہو گیا ہے...... باباجی میرے اللہ وسائے کی نوکری کہیں لگ جائے...... بابا جی اللہ وسایا پھر بیوی پنڈ چھوڑ آیا ہے کیا کروں......؟"

سرداراں مکمل طور پر اللہ وسایا میں مگن بولتی رہتی...... شہاب بھائی پوری توجہ سے سنتے رہتے کبھی مشورہ نہ دیتے کبھی بات نہ بڑھاتے...... مدد کرنا چاہتے تو مجھے پیسے دے دیتے کبھی اسے احسان مند کرنے کی کوشش نہ کرتے...... ایک روز جب سرداراں غسل خانہ دھو کر جا رہی تھی تو شہاب بھائی بولے...... "کیا اچھی عورت ہے ہاتھ سے ٹاکی پھیرتی رہتی ہے اندر سے اللہ وسائے کا ہاتھ پکڑے رکھتی ہے...... کہیں اسے ذکر کرنا آجائے تو بیڑا پار ہو جائے......"

پھر مجھے پچاس روپے کا نوٹ دے کر بولے...... "جب میں چلا جاؤں تو اسے دے دیجئے گا......"

میں نے نوٹ لے لیا......

"آپ دیکھیں گی اس بار میں بھی اسلام آباد جا کر اپنا Conduct اسی طرح درست کروں."

میں نے دل میں سوچا...... بھلا اب یہ کیا درست کریں گے؟

"چھوٹے بڑے کنک ہیں۔ کئی آلائشیں ہیں...... انمل بےجوڑ باتیں ہیں۔ وقت کم ہے خرابیاں زیادہ ہیں۔ کون جانے حسن خاتمہ ہو بھی پاتا ہے کہ نہیں......؟" جس روز شہاب بھائی ہم سے رخصت ہوئے سرداراں فرش پر بیٹھ گئی اور ان کے پلنگ پر ہاتھ رکھ کر بولی...... "ہائے ہائے ساڈے بابے دی کی لوڑ سی رب نوں؟ ہور مخلوق گھٹ اے؟ ہن میں کس نال اللہ وسائے دیاں گلاں کراں......"

بھلا میں سرداراں کو کیا سمجھاتی کہ ایسے ہی لوگوں کی گلاں سننے کو تو اوپر بلایا جاتا ہے ٹکٹکی کی آواز برملا سننے کے لئے تو کھلے آسمانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کملئے سرداراں ایسے ہی لوگوں کی تو ضرورت رہتی

ہے...... یہاں اور وہاں۔

پھر یوں ہوا......

اشیر کا دوست علی گھر سے بھاگ کر ہمارے ہاں آگیا...... وہ پڑھائی سے اوب چکا تھا اور اے لیول کا امتحان دینا نہ چاہتا تھا۔ اس کی ماں نینی خوف میں گھری سارے شہر میں یوں ہراساں کار دوڑائے پھرتی تھی جیسے شہر میں ایٹم بم پھٹنے والا ہو...... علی انگریزی میں نازک نازک نظمیں لکھتا تھا۔ اس کے دل پر لڑکیوں کے چاند طلوع ہونے لگے تھے۔ وہ ماں کو خوش کرنے کے لئے پڑھائی کرنا چاہتا لیکن خوبصورت کپڑے، نوجوان امیر دوست، ٹیلی فون کرنے والی لڑکیاں...... انگریزی کے خوبصورت مصرعے اسے گھر بیٹھنے نہ دیتے۔

نینی ہر رشوت دے کر تھک گئی۔ اس نے ان گنت ٹرولیاں علی کے لئے سجائیں اسے ملک ملک پھرایا...... شہر میں ہونے والے تمام ورائٹی شو دکھائے...... لیکن علی احسان مند ہو کر پڑھائی کے جال میں نہ پھنسا اور ایک دن اشیر خاں کے ساتھ گھر آگیا۔

شہاب بھائی بھی ان دنوں کاسنی کمرے میں رہتے تھے۔

یہ بڑی طوفانی شام تھی۔ شہاب بھائی بنچ پر بیٹھے تھے۔ نینی خوفزدہ تھی کہ اگر اس کا اکلوتا بیٹا ناکارہ نکل آیا تو کیا بنے گا؟! اشیر شہاب بھائی کا منہ تک رہا تھا جیسے جانتا ہو کہ اب کچھ بگڑ نہیں سکتا۔ علی سب سے دور شودروں کی طرح جوتیوں کے پاس بیٹھا تھا...... فضا میں چار سو چالیس وولٹ کی شکتی تھی۔ ہر بات پر کسی نہ کسی کو کرنٹ پڑتا۔ شہاب بھائی چپ تھے نینی سرخ سرخ چہرہ لئے شکوے شکایتوں کی تار پر علی سے ہوتی ہوئی اپنے شوہر فضلی تک جا پہنچی تھی اس کے خوف کچھ اس طرح اسے شاک لگا رہے تھے کہ وہ جو کچھ بھی بولتی نیم چیخ کی شکل اختیار کر لیتا...... بڑی دیر کے بعد شہاب بھائی نے کہا...... "اس کے معاملے میں آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں یہ خود ہی اپنے لئے درست فیصلہ کر لے گا......"

نینی شہاب بھائی کے کہنے پر بڑی یقینی کے عالم میں علی کو ساتھ لے گئی اسے شہاب بھائی کی بات کا شاید یقین تو نہیں تھا لیکن وہ اشیر خاں کے باباشہاب کے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

دو دن بعد نینی ہمارے گھر آئی تو اس کا چہرہ پروڈگل سن کی واپسی پر ڈلک رہا تھا اس نے گلابی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے شہاب بھائی نے پوچھا...... "وہ جو خاتون اگلی شام آئی تھی اس کا کیا نام ہے......"

"نینی...... نسیم فضلی......" خان صاحب نے جواب دیا۔

"کل رات میں نے دیکھا اس نے گلابی لباس پہنا ہوا ہے اور وہ ایک ایسی محفل میں ہے جس کا میں عقیدت کی وجہ سے بیان نہیں کر سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ بہت پائے کے بزرگوں کے ساتھ تھی.........."

کچھ دیر بعد نینی آئی اس نے گلابی لباس پہنا ہوا تھا اور وہ علی کی حرکتوں کے باعث اور اپنے خوف کے ہاتھوں جاں بلب تھی۔ جب وہ کچھ دیر بعد جانے لگی تو شہاب بھائی تیزی سے بنچ سے اٹھے اور اس کے قریب جا کر بولے..... "ایکسیوزمی کیا آپ میرے لئے دعا کر سکتی ہیں"۔

نینی ششدر رہ گئی اس نے بڑی لجاجت سے کہا..... "جی ضرور..... " لیکن میں آپ کے لئے کیا دعا کروں۔ آپ کے پاس تو سب کچھ ہے"

"آپ میرے حسن خاتمہ کے لئے ضرور دعا کر دیجئے گا"۔

نینی خاموش چلی گئی..... میں نے حسد کی لہر کو اپنے اندر ابھرتے دیکھا..... مجھے نینی بڑی ہی خوش نصیب نظر آئی جس سے شہاب بھائی نے دعا کی استدعا کی تھی۔

شہاب بھائی کسی چیز کو Correct نہیں کرتے تھے۔ بڑی گاڑیاں' عورتیں' خوبصورت بنگلے..... میں نے کبھی ان کے منہ سے یہ بات نہ سنی کہ کاش یہ مجھے مل جائے۔ چونکہ وہ للچاہٹ سے کسی چیز کو نہ دیکھتے تھے اس لئے میں نے کبھی انہیں تجویز کرتے بھی نہیں دیکھا اور اسی لئے شاید وہ حسد کا شکار کبھی نہ ہوئے۔ نظریات میں توازن' گفتگو میں نرمی' لباس میں میانہ روی' خوراک میں سادگی' دوستی میں ثابت قدمی' رابطوں میں مہربانی' ناراضگی میں خاموشی اختیار کرتے۔ وہ سچ بولتے لیکن سچ کو دل آزاری کے طور پر استعمال نہ کرتے۔ پیسے ان کے بٹوے میں ہوتے تو نہ انہیں پنکھا لگ جاتا کہ خرچ کر ہی لیں نہ اس قدر انہماک ہوتا کہ کتنے بچ گئے ہیں۔ اور ان کے بچنے کے ساتھ اب بنک بیلنس کس قدر ہو گا؟ انکساری اور تحمل نہ کسی کو مرعوب کرنے کے لئے نہ اپنے آپ کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے استعمال میں تھا۔ بس انہیں علم تھا کہ کوئی شخص آپ سے کمتر نہیں..... ایک مرتبہ صبح کے وقت جب وہ ناشتے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا..... "چلئے شہاب بھائی مان لیا کہ آج کے زمانے میں جب عقل اور تعلیم اتنی بڑھ گئی ہے ہم بیعت کے تمام کوائف پورے نہیں کر سکتے لیکن بالفرض کوئی شخص پکا ارادہ کر لے تو پھر وہ مرشد کیسے تلاش کرے؟" شہاب بھائی بولے......

"اول وہ شخص آپ کو خود ہی ملے گا اور آپ کی سچی لگن کی کنڈی میں پھنس کر آپ کے پاس آئے گا۔ بالفرض ایسے نہ ہو۔ تو صبح سویرے گجر دم اٹھتے ہی پھاٹک کھول کر کھڑے ہو جائیں جو پہلا آدمی نظر آئے اسے اپنا مرشد مانیں اور اپنی خواہش کے مقابلے میں اس کی رائے کو صائب جانیں"۔

یہ شہاب بھائی کا آخری پھیرا تھا۔

وہ رات کو دودھ میں شہد اور بادام روغن ملا کر پیا کرتے تھے۔ انیق خاں کی بیوی غزل نے کئی بار ان سے

پوچھا کہ چچا دودھ لاؤں۔ میں نے بھی کہا...... "شباب بھائی چھوٹی مکھی کا شہد آیا ہوا ہے آپ ضرور پئیں"۔ لیکن وہ مائل نہ ہوئے......ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور چلنے پھرنے میں تھکان کے آثار تھے۔

ہمارا معمول تھا کہ جب وہ کاسنی کمرے میں موجود ہوتے اتنے دن ہم رات کے کھانے پر کہیں نہ جاتے لیکن اس بار انہوں نے خود کہا۔

"واصف صاحب کی محفل میں ہم سب چلیں گے، بہت سے لوگ مل جائیں گے" لیکن جس محفل میں ہم سب نے شرکت کی وہاں انہوں نے میزبان کے اصرار کے باوجود کچھ نہ کھایا۔ وہ کوئی بھی پکی ہوئی چیز کھانا نہ چاہتے تھے۔

دوسری شام کہنے لگے...... "اشتیاق کے گھر کھانا ہے اشیر بتا رہا تھا کہ تم دونوں نہیں جا رہے"۔ میں نے کچھ من گھڑت جواب دیا۔

بولے...... "ہم تینوں چلیں گے اشتیاق سے ملے مجھے ایک عرصہ ہو گیا ہے"۔

"تجھے تو لوگوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے قدرت......" خان صاحب نے کہا۔

"ہاں ہوتی ہے...... ہوتی تو ہے...... لیکن تمہارا بھائی مجھے اچھا لگتا ہے......
بڑا نفیس آدمی ہے"۔

اس آخری قیام کے دوران وہ ہمارے ساتھ ہر ڈنر پر گئے۔ لوگوں کے ساتھ اصرار کے ساتھ ملے۔ باتیں کیں اور پھر اپنے پیٹنٹ جملے کے ساتھ اسلام آباد چلے گئے۔ کئی سالوں سے وہ جانے سے پہلے ایک ہی جملہ بولا کرتے تھے۔

"اس بار میں اسلام آباد جا کر اپنا Conduct درست کروں گا......"

ان کے جانے کے بعد ہم دیر تک یہی باتیں کرتے رہے کہ اگر شباب صاحب کو اپنا کردار درست کرنے کی ضرورت ہے تو ہم اس سلسلے میں کیا کریں؟۔ خان صاحب اور اشیر خاں شباب بھائی کو اسلام آباد چھوڑ کر واپس آئے تو دونوں کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ سارا راستہ آپس میں بالکل نہ بولے تھے۔

رات حبس سے بوجھل تھی۔ کمروں میں نمی تیرتی پھرتی تھی۔ ہمارے ہمسائے میں لگے ہوئے بیری کے درخت دم بخود کھڑے تھے۔ اتنی ہوا بھی نہ چل رہی تھی کہ انار کے نازک پتے ہلتے۔ لان میں نیون لائٹ پھیلی تھی اور اس کی چٹی روشنی میں لان کی گھاس نیلی نظر آتی تھی۔ پھر ایک فون کی گھنٹی بجی...... رات گئے ہمارے گھر کئی بار رانگ نمبر بجتے ہیں کبھی کبھار ایسے لوگ بھی فون کرتے ہیں جو اداس 'ڈرے ہوئے' معاشرے سے نالاں ہوتے ہیں۔ لیکن اس گھنٹی میں ہلا دینے جھنجھوڑ دینے کی توبت تھی۔ خان صاحب جو بھاگ کر کبھی فون تک نہیں پہنچتے ایک ہی جست میں فون کے قریب تھے۔

"ہاں...... ہاں...... بالکل حق ہوا...... ہاں...... میں سن رہا ہوں...... ٹھیک ہے......

صبح تڑکے چلوں گا ہاں ہاں......وہ ساتھ ہوں گے...... کیوں نہیں حق ہوا......
بالکل"

میں نے خان صاحب کا چہرہ دیکھا

"تو شباب بھائی چلے گئے......؟"

"ہاں......"

میں نے فوراً ماں بن کر سوچا...... "خان...... اشیر کو نہ بتائیں پلیز......وہ اتنی برداشت نہیں رکھتا......"

"لیکن اسے تو ڈرائیو کرنا ہو گا......" خان صاحب بولے

"وہاں چل کر پتہ لگ جائے گا......"

"اچھا......"

ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے میں نے پھر ماں کی طرح سوچا...... "خان...... غزل کو بھی نہ بتائیں اس کا امتحان ہے......پرچہ خراب ہو جائے گا......"

"اچھا......"

ہم دونوں چپ چاپ اندر کمرے میں آ کر بیٹھ گئے...... کھڑکی میں سے جامن کا وہ گھنا درخت نظر آنے لگا جس کے اندر کہیں بتی جل رہی تھی۔ ہم دونوں خالی ذہن تھے۔ دونوں میں ہمت نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ نہ جانے ہم کب تک ایسے ہی بیٹھے رہتے...... لیکن یک دم اشیر خاں شہتیر کی مانند کھڑا ہو کر انگریزی میں بولا "پر وہ تو چلے گئے ہیں......وہ تو چلے گئے ہیں امی...... میں نے انہیں جاتے دیکھا ہے میں ان کے ساتھ جاؤں گا......"

میں نے کھڑے اشیر کی جانب دیکھا وہ پوری طرح سو رہا تھا اس کے کندے تھپکتے نہ جانے کس وقت میں بھی سو گئی۔

تڑکے ہم تینوں چپ چاپ اٹھے اور اسلام آباد جانے کی تیاری کرنے لگے۔ میری امی نے بھانپ لیا لیکن وہ خاموش رہیں جیسے اس وقت کچھ بھی بولنا بے معنی تھا۔ ہم گوجرانوالے تک یہی ظاہر کرتے رہے جیسے شباب بھائی بیمار ہوں اور ہم تینوں انہیں ہسپتال دیکھنے جا رہے ہوں لیکن اشیر خاں نے اس بیماری کے ڈرامے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ گوجرانوالہ کے بعد ہم تینوں خاموش ہو گئے۔ کبھی کبھی وہیل پر اشیر کے ہاتھوں پر اچانک پانی کی بڑی بڑی بوندیں آ گرتیں اور وہ کسی ٹرک کو ایسے کراس کرتا جیسے ڈرائیونگ میں نو آموز ہو۔

انیق خاں امریکہ میں تھا۔

ثوبیہ ،انیس کو اطلاع نہ دی جاسکی۔

غزل کو میں نے اس لئے نہ بتایا کہ اس کا پرچہ تھا لیکن وہ دو بجے اکیلی اسلام آباد آگئی اندر باہر ہجوم تھا۔ ایسے لوگ جن کی آج تک کسی نے نہ سنی تھی...... ایسے جن کی سب لوگوں نے سنی تھی اور وہ پھر بھی لفظوں سے ،باتوں سے ،شکایتوں سے پرے تھے...... وہ لوگ جن کے نزدیک تقدیر بہری ،فطرت ظالم اور معیشت ناانصاف تھی...... بڑھی مائیاں جن کے ہاتھوں میں سبز چادریں تھیں......جوان جو جینز پہنے ہوئے تھے...... تنومند عورتیں جو سیاہ چشموں کے پیچھے رو رہی تھیں...... ایسے سرکاری افسر جو شلوار قیصوں میں ملبوس اپنی آدھی پرسنیلٹی گھر ہی چھوڑ آئے تھے۔ لان میں ،سڑک پر ،کمروں میں لوگ ایسے پھر رہے تھے جیسے ٹرین کے حادثے کے شکار مسافر پٹڑی کے ساتھ ساتھ چکر لگاتے ہیں۔ تمام گنجے ،لولے لنگڑے ،ڈرے ہوئے ،خوفزدہ ،بھولے بھٹکے ،سیڑھیوں پر چڑھتے ڈر رہے تھے کہ اوپر ایک درویش بڑے آنند سے ان سب کے ہوتے ہوئے اپنے حسن خاتمہ کو پہنچ گیا تھا...... فضا گرم تھی اور اس میں نمی پوری سو فیصد تھی۔

سوئم کے روز سب آہستہ آہستہ سیپارے پڑھ رہے تھے۔میں کھڑکی کے رخ بیٹھی تھی اور سیپارہ دیکھنے ،سمجھنے اور پڑھنے کے درمیان کہیں معلق تھی۔ پھر گڈی کہیں سے آگئی اور اپنا محبت بھرا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ اس کے وجود سے مجھے وہی محبت کی خوشبو آئی جو شہابوں کا خاصا ہے۔

"چچی سیپارہ جلد ختم کرلیں...... دعا ہونے والی ہے......"

میں نے سیپارے سے نگاہ اٹھا کر اندر کی طرف دیکھا۔ ثاقب ایک بجھی سی عورت کو پانی کا گلاس دے کر غسل خانے کے ساتھ کندھا جوڑے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف آنکھیں خشک آنسوؤں سے چمک رہی تھیں......اوپر جانے والی سیڑھیوں پر یوگی اشفاق کھڑے زانوؤں پر ہاتھ دھرے کچھ تہیہ کرنے کچھ چھوڑ دینے کے انداز میں بیٹھے تھے۔ قالین پر نیلی جینز میں ملبوس پتنگ کی طرح کھنچا چہرہ لئے اثیر خاں اتنا چپ تھا جتنے بادل برسنے سے پہلے ہوتے ہیں۔ عکسی مفتی بہادر ہونے کی کوشش میں چل پھر رہا تھا۔ پر اس کی جعلی بہادری کانپتے ہاتھوں سے ظاہر تھی...... اندر باہر......چہرے ہی چہرے تھے۔

ان خالی چہروں سے گھبرا کر میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں چاند کا ہاتھ چھڑا کر اکیلا ستارہ جما کھڑا تھا۔

شہاب بھائی کے گزر جانے کے عین تیسرے دن مجھے ایک سوال کا جواب مل گیا جو پچاس سال پہلے میں نے اپنی ماں سے پوچھا تھا "امی گزر گیا کیا ہوتا ہے...... لڑکیاں کہتی ہیں میرا باپ گزر گیا ہے......"

میری ماں بہت بھولی ہے۔وہ بڑے سے بڑا صدمہ سہہ کر بھی تاش کھیل سکتی ہے۔

سکریبل کے الفاظ سوچ سکتی ہے۔ کرکٹ کمنٹری سن سکتی ہے تالیاں بجاتی اپنے نواسوں کو آوازیں دیتی بر آمدے میں گھوم پھر سکتی ہے۔ لیکن میرے اندر جب کوئی سوال جنم لے کر صدمے کی شکل اختیار کرتا ہے تو پھر مجھے آزاد نہیں کرتا...... سوال خود بھی گرداب بنا رہتا ہے اور مجھے بھی چکر پھیریاں دیئے جا رہا ہے۔

اس شام اثیر خاں ،یوگی اشفاق ،ثاقب ،...... مفتی جی ،عکسی......ان گنت چہروں میں میرا سوال ابھر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی والے ستارے کی طرف منت سے دیکھا۔

جب کوئی رعایت کرنے ،بات سمجھنے ،پناہ دینے والا بابرکت باپ اپنے خوفزدہ یتیم بچوں کو زندگی سے دست پنجہ ہونے کی تعلیم دیئے بغیر گزر جاتا ہے تو پھر ایسے خوفزدہ یتیم بچے ساری عمر آسمان کو تکتے رہتے ہیں۔ دن کے وقت وہ دھوپ دریچوں میں ایک جانے جانے چہرے کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شام کو پہلے ستارے کی آمد پر ان کا احساس جلاوطنی کبھی کبھی اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ وہ میری طرح گھبرا کر کہنے لگتے ہیں...... "امی میں وہاں سے آئی ہوں اس چمکدار ستارے میں میرا گھر ہے"۔